میں "کے ٹو" سر کرنے والے پہلے پاکستانی اشرف امان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کے دوستانہ تعاون کے باعث ہم یاک سرائے تک پہنچے----

خصوصی شکریہ! اکرام بیگ - کریم جان - عبدالاحد' وارث
عارف اسلم - رحمت نبی (فیری میڈو) - سجاد احمد - قادر
قیصر چیمہ - ڈاکٹر نیامت شاہ - کینجابائی
پورٹر تگیر اور خوشحال ---- اور جمیل کرومبر

یاک سرائے

محبت

"کہیں بلند پہاڑوں میں----- محبت کیا ہے؟"

"اور اگر تم تنہا ہو--- اکیلی ہو، اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں--
تو یقین کر لینا کہ---
کہیں بلند پہاڑوں میں---

"رسول- مجھے یہ بتاؤ کہ محبت کیا ہے؟"

رسول حمزہ توف نے اسلام آباد کی خالی، بے کیف اور بے رُوح دھوپ میں میرے چہرے کو دیکھا--- اور میں نے اُسے دیکھا اتنی برس، جس میں اُس کی بے شمار محبتیں تھیں- آوار زبان اور ابوطالب کی پاپاخ ٹوپی تھی--- اُس نے مجھے دیکھا مجھے علم نہیں کہ اُس بے روح دھوپ والی صبح میں رسول نے میرے چہرے پر کیا دیکھا--- بلند پہاڑوں کی شاہ گوری کی محبت دیکھی--- سرسوں کے کھیتوں اور پنجاب کے کیکر کے درختوں کے زرد پھولوں کی مہک دیکھی--- اور اُس کا سرخ و سپید چہرہ مسکراہٹ میں کھلا اور اُس نے کہا "محبت مائی فرینڈ--- ایک داستانی عقاب ہے جو صرف ایک بار کسی ایسی چٹان پر بیٹھتا ہے جہاں وہ صرف ایک پھول دیکھتا ہے جو زرد ہے--- اور ایک ایسی جھیل کو دیکھتا ہے جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی--- ایک نادیدہ جھیل اور ایک محبت میں مبتلا عورت میں فرق نہیں ہوتا مائی فرینڈ مستنصر---"

"کیا ہر شخص کے نصیب میں یہ محبت ہوتی ہے رسول؟"

"نہیں---" رسول نے سر ہلایا، میری طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں اتنی برسوں کی محبتیں تھیں--- "نہیں کوئی ایک چرواہا ہوتا ہے جو اپنی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کرنے جاتا ہے اور کسی چراگاہ کے آخری گھاس کے تنکے سے پرے وہ ایک ایسی جھیل دیکھ لیتا ہے جو پہلے وہاں نہیں تھی--- نہیں--- کوئی ایک شخص ہوتا ہے جس کے نصیب

میں ایک عشقِ خاص آتا ہے---"

"عشقِ خاص؟"

"ہاں--- یہ ایک--- داغستانی تجربہ ہے جو نصیب والوں کے دل میں اُترتا ہے--- یہ ایک منطقی گھوڑا ہے جو داغستان کی چاندنی راتوں میں ایک پہاڑی آبشار کے پہلو میں تمہارا منتظر ہے اور تمہیں ایسی وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں کے پھولوں کو کوئی ذی روح پہلی بار دیکھتا ہے' اور وہ تم ہوتے ہو--- یہ کوباچی کی ایک منقش صراحی ہے جسے ایک کاریگر سونے چاندی سے نہیں بلکہ اپنے سوتے ایسے ہاتھوں سے بناتا ہے اور پھر اُس کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں---"

"رسول--- یہ سارے استعارے--- یہ سارے پس منظر تمہارے وطن کے ہیں۔ مجھے صرف یہ بتادو کہ محبت کیا ہے؟"

"محبت---" اُس نے سر اٹھایا اور اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ میں سر اُٹھایا' اور کہنے لگا "محبت وہ ہے جو تمہاری جانب آرہی ہے---"

اور نیشنل لائبریری کے وسیع ٹیرس پر جہاں دنیا بھر کے ادیب اور دانشور اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ کی طرح کے بے رُوح سیمینار کی کوفت سے دوچار ہونے کے بعد چائے کی میزوں کے گرد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور پہچان کی کوششوں میں تھے وہاں--- وہ ہماری جانب آرہی تھی---؟

کل--- کانفرنس کے افتتاح کے بعد کچھ ایسے لوگ تھے جن کے قریب میں ہونا چاہتا تھا اور کچھ ایسے تھے جو میرے قریب ہونا چاہتے تھے اور اس کشمکش میں مائیکرز کے شور اور آوازوں کی جھنجھناہٹ میں کہیں کسی شخص نے اپنے قریب سے گزرتے کسی ادیب سے کہا۔ رسول حمزہ توف بھی کانفرنس میں آیا ہوا ہے---

میں نے مڑ کر دیکھا' فوراً مڑ کر دیکھا--- توفیق فواد' معروف فلسطینی افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس توفیق اپنے خوش شکل چہرے پر اپنی لاپرواہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک افریقی شاعرہ کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔

"توفیق---" میں اپنی نشست سے اُٹھا۔ اُس کے کوٹ کے کالر کو پکڑ کر ایک آفت زدہ شخص کی گھبراہٹ اور ایمرجنسی کے ساتھ کہا "تم نے کیا کہا ہے؟"

"کب میں نے' کس کو کیا کہا ہے مستنصر--- میں تو اس افریقی خاتون کے ساتھ تازہ امن سمجھوتے کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہا تھا--- یاسر عرفات نے

ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے---"

"نہیں توفیق--- تم نے ابھی ابھی--- رسول کا نام لیا ہے۔"

"اس لئے کہ میں خود رسول کا نام لیوا ہوں---" اُس کی شگفتگی مجھے اس موقع پر اچھی نہ لگی۔

"نہیں نہیں--- کیا تم نے رسول حمزہ توف کا نام نہیں لیا؟"

"ہاں--- داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ توف جن کی نظموں کے تراجم ہمارے فیض صاحب نے کئے ہیں "سروادیِ سینا" میں--- بالکل' وہ اس لمحے کانفرنس ہال میں ہیں اپنی سخت گیر بیوی کے ہمراہ منہ کھولے نہایت بوریت سے مقالے سن رہے ہیں اور اونگھ رہے ہیں---"

میرا ایمان ہے کہ اگر کوئی ایک شخص اپنی غیر موجودگی سے ایک شہر کو ویران کر دینے پر قادر تھا--- تو وہ احمد داؤد تھا--- اس نے اپنی موت سے اسلام آباد کو کم از کم میرے لئے ویران کر دیا ہے--- تو یہ احمد داؤد ایک شام--- احمد پرویز کی ہمشیرہ آنسی ناز--- یا ایرک سپرین یا افضل نیاز کے گھر کے راستے میں مجھے کہتا ہے "آپ نے "میرا داغستان" پڑھی ہے؟"

"ہاں---"

"پھر؟"

"ایک عرصہ پہلے پڑھی تھی--- اچھی کتاب تھی---"

"تم نے ایک عرصہ نہیں بہت عرصہ پہلے اُسے پڑھا تھا---" وہ یکدم اپنی سیماب عادت کے زیرِ اثر--- آپ کی بجائے "تم" پر آگیا "تب تم کچھ نہیں جانتے تھے--- اُسے اب پڑھو وہ صرف ایک اچھی کتاب نہیں ہے---"

اگلے روز وہ اپنی جبلی افراتفری میں میرے پاس آیا اور مجھے "میرا داغستان" تھما کر اسی افراتفری میں اسلام آباد ہائی وے کے برابر میں اُس جوہڑ کی طرف چلا گیا جہاں اُس کے خیال کے مطابق سورج غروب ہونے پر جو سُرخی پانیوں میں اُترتی تھی وہ کوہِ طور کی تجلیوں کے ہم پلہ تھی---

میں نے اسی شب--- اور یہ ایک طویل شب تھی جو صبح کے دروازوں پر دستک دیتی تھی--- "میرا داغستان" پڑھی اور ظاہر ہے تیس برس بعد دوبارہ پڑھی--- اور واقعی مجھے پہلے سمجھ نہ تھی--- میں اُس کا اسیر ہو گیا--- بڑی کتابیں تجربہ کار عورتوں کی طرح

ہوتی ہیں۔ جب تک آپ کا تجربہ اُن کے ہم پلہ نہیں ہوتا آپ انہیں نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ میں رسول حمزہ توف کا اسیر ہو گیا۔ میں اُس کے داغستان اور مٹی کی محبت میں قید ہو گیا۔۔۔ وہ مجھے اپنے پنجاب کے قریب لے آیا تھا۔۔۔ وہ مجھے اُس کے ایک ایک درخت، ہر موسم، ہر جوہڑ اور ہر داستان کے قریب لے آیا تھا۔۔۔ میں نے کبھی سوہنی کے حسن یا ہیر کے رانگلے پلنگ یا صاحباں کے جنس بھرے عشق پر غور نہیں کیا تھا۔۔۔ رسول نے مجھے اپنے بے توقیر اور بے بس ادیب ہونے کا احساس دلایا۔۔۔ میرا دامن اُس کی نسبت کہیں زیادہ پُرکشش اور ہیرے موتیوں سے مالا مال تھا لیکن میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔۔۔ اور ایک ندامت بھی تھی۔۔۔ میں رسول جیسا ایک صفحہ بھی لکھنے پر قادر نہیں تھا۔۔۔

احمد داؤد، سوویت یونین کے بکھرنے پر ازحد رنجیدہ تھا۔۔۔ ایک عظیم خواب کے منتشر ہونے پر غم زدہ تھا۔۔۔ لیکن اُس کے صحت مند، اور بھیڑیوں ایسے پھرتیلے بے چین بدن میں مسرت کی ایک لہر بھی تھی۔۔۔ "یار تارڑ۔۔۔ داغستان بھی آزاد ہو گا۔۔۔ یہ کیا عجیب سی ریاست ہے چیچنیا۔۔۔ اس کے ساتھ جو داغستان ہے ہم دونوں وہاں جائیں گے۔۔۔ اور سدا کے گاؤں میں رسول حمزہ توف سے ملیں گے۔"

ہم نے ایک بدلتی ہوئی دنیا اور بدلتے ہوئے جغرافیے کے نقشے پر سر جھکائے اور ہم دونوں ازحد مایوس ہوئے۔۔۔ داغستان۔۔۔ چیچنیا کے نواح میں۔۔۔ اب بھی رُوسی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔

"یار کیا فائدہ ہوا سوویت یونین کے منتشر ہونے کا۔۔۔ اگر داغستان آزاد نہیں ہوا۔۔۔" داؤد نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ہم کبھی بھی رسول حمزہ توف سے نہیں مل سکیں گے" اپنی بے وجہ اور نہ سمجھ میں آنے والی موت کے چند روز پیشتر داؤد نے آزردہ ہو کر کہا تھا۔

اور وہی رسول حمزہ توف، اس دیوار سے پرے ادیبوں کی مخدوش بین الاقوامی کانفرنس میں نیشنل لائبریری کے ہال میں۔۔۔ موجود تھا۔۔۔ لیکن احمد داؤد موجود نہیں تھا۔۔۔ وہ مومن پورہ کے ایک ویران قبرستان میں۔۔۔ اور کونسا قبرستان ایسا ہے جو ویران نہیں ہوتا۔۔۔ وہ اُس قبرستان میں جہاں کوّے بہت ہیں اور اُن کی بیٹ قبرستان کی قبروں کو سیاہ کرتی ہے وہاں۔۔۔ کی گمنام مٹی میں۔۔۔ ایک زرد اور پھولے ہوئے مردہ چہرے کے ساتھ۔۔۔ بہت ساری ناآسودہ۔۔۔ آرزوؤں کے ساتھ۔۔۔ اور اُن میں سے ایک آرزو رسول سے ملنے کی تھی۔۔۔ زیرِ زمین مٹی ہو رہا ہے۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ اُس کی بے چین تخلیقی آرزو اور بے مثل بے راہ روی کا ایک اظہار موجود تھا۔۔۔ میں تھا۔۔۔

اور وہ نہیں تھا۔۔۔

کانفرنس ہال کی دسویں قطار میں وہ۔۔۔ اپنی بیوی کے ہمراہ ایک آرامدہ نشست میں ڈھیر اپنے آس پاس سے بے خبر، لاتعلق، شاید اپنے داغستان کے کسی آبشار کے دھارے میں شرابور، کسی کھڑکی میں منتظر شکل میں گم عمر کی طویل مسافت سے تھکا ہوا ایک نشست میں آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

میں نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا "رسول۔۔۔ پلیز آپ باہر آ جائیے۔۔۔"

اُس نے شاید مجھے کانفرنس کے کسی کارندے کے رُوپ میں دیکھا۔۔۔ بمشکل اپنی نشست سے اٹھا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے باہر آ گیا۔۔۔ وہ داغستانی عقاب برسوں کے بوجھ تلے دبا ہوا مشکل سے قدم اٹھاتا میرے ساتھ باہر آ گیا۔

میں نے اسے ایک پلاسٹک کی بے آرام کرسی پر بٹھایا۔ فرش پر اُس کے قدموں میں بیٹھ کر اُس کے گول مٹول پھول ایسے ہاتھوں کو چوما اور کہا "میں آپ کا مرید ہوں"

اس نے مسکرا کر صرف اتنا کہا "مائی فرینڈ۔۔۔" کیونکہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا اور میں نے برسوں پہلے جو تھوڑی بہت رُوسی سیکھی تھی وہ میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی یہاں تاجکستان کی ترچھی آنکھوں والی رئیسہ محی الدین میرے لئے رابطے کا راستہ بن گئی۔ "میں ترجمہ کروں گی جو کچھ رسول کہتے ہیں۔"

اگلے روز رسول نے کہا "میں نے کل کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں کچھ کہنا ہے۔ کیا تم میری کسی نظم کا اردو ترجمہ پڑھ سکتے ہو۔۔۔ کل گیارہ بجے۔۔۔"

"ہاں رسول۔۔۔ میں کل۔۔۔ گیارہ بجے آپ کے ساتھ ہوں گا۔۔۔ آپ کی کسی نظم کے اردو ترجمے کے ساتھ"

اور جب اگلے روز میں پُورے وقت پر کانفرنس ہال میں داخل ہوا تو۔۔۔ معلوم ہوا کہ کسی ایک مقرر کے علیل ہونے کے باعث رسول کی تقریر گیارہ کی بجائے ساڑھے دس بجے شروع ہو گئی تھی اور وہ۔۔۔ جب میں ہال میں داخل ہوا تو وہ رئیسہ کی ترجمانی میں اپنی تازہ ترین نظم "عورت کے لئے" سنا رہا تھا۔۔۔

اور اب نیشنل لائبریری کے وسیع ٹیرس۔۔۔ پر جب وہ ایک منڈیر پر بیٹھا تھا اور میں فرش پر براجمان اس کے سرخ و سپید اسّی برس کی محبتوں والے چہرے کو دیکھتا تھا تو میں اس سے یہی پوچھتا تھا کہ رسول مجھے یہ بتاؤ کہ محبت کیا ہے۔۔۔ اور اُس نے سر اٹھا کر کہا تھا "محبت۔۔۔" اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ میں۔۔۔ "محبت وہ ہے جو تمھاری

جانب آ رہی ہے---"

میں نے ادھر دیکھا۔ اور وہاں کچھ بھی نہ تھا--- بے رُوح دھوپ تھی، چائے کی میزوں کے گرد بے روح ادیب تھے--- وہاں کچھ بھی نہ تھا--- میں نے رسول کی طرف دیکھا--- کہیں وہ مجھ سے شرارت تو نہیں کر رہا؟ اُس کا سفید چہرہ مسکراہٹ میں ایسے کھلتا تھا کہ عمر کی جھریاں پنکھڑیوں کی طرح واضح ہوتی تھیں---

"تم اگر تنہا ہو--- اکیلی ہو--- اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں---
تو یقین کر لینا--- کہیں بلند پہاڑوں میں---"

اگر وہ میری جانب آتی تو قیاس ہے کہ عرش منوّر پہ باتیں ملتیں اور میں انہیں تخت لور میں بیٹھے سُن لیتا---

"وہاں کچھ بھی نہیں رسول---"

"ہے--- اگر تم دیکھنا چاہو تو---"

وہاں کچھ ہوتا تو عشق کے مارے ایسے پھرتے جیسے جنگل میں ڈھور---

وادیِ خپلو میں دریائے شیوک کے رواں پانیوں میں اُس شبِ ماہتاب میں جہاں ہر سائے تلے عکس جھلکتا تھا--- اُس عکس در عکس آئینہ خانے میں کیا جھلکتا ہے--- جو کسی اور کو نظر نہیں آتا صرف میری آنکھیں اُسے دیکھتی ہیں یا تخلیق کرتی ہیں--- شاید ایسے ہی رسول وہ کچھ دیکھنے پر قادر ہے جو مجھے نظر نہیں آ سکتا---

رانجھن تخت ہزارے دا سائیں اتھے بنیا چور---

داغستان کے تخت کا سائیں--- رسول--- میں نے پھر اُس کی جانب دیکھا۔ عمر رسیدہ چہرے پر پچھلی محبتوں کی روشنی اور کوہستانی چراگاہوں کی ہریاول تھی "وہ موجود ہے اگر--- تم اُسے دیکھنا چاہو تو---"

اداسی کی تہوں میں سے کیا نکلتا ہے--- شوست کے اُدھر، چین کی سرحد کے آس پاس--- مارخون کی گھٹاٹوپ اندھیارے میں صابر قاضی نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مار کر مجھ سے پوچھا تھا۔ ویسے ہم کیوں ہیں؟

"کون کیوں ہیں؟"

"ہم، اور کون---"

اور میں اُس اندھیرے میں اکیلا رہ گیا تھا اور ایک گیت مارخون کی رات میں--- دریا کی روانی کے ہلکے شائبے میں میری طرف آتا تھا---

ہیلو--- کیا تم مجھے تلاش کر رہے ہو؟

پتہ نہیں تم اس لمحے کہاں ہو--- اور پتہ نہیں تم کیا کر رہے ہو---

نیشنل لائبریری کے ٹیرس پر جو دھوپ تھی وہ زرد ہونے لگی--- اگرچہ اس کے پار ڈپلومیٹک انکلیو کے اردگرد جو گھنے جنگل تھے وہاں وہ اُسی طور بے روح اور سفید تھی--- یوں لگتا تھا جیسے صرف ٹیرس پر اُترنے والی دھوپ میں زردی گھول دی گئی ہو--- اس زردی میں ہر شے زرد نظر آنے لگی--- بیمار چہرے کی نہیں سرسوں کے کھیت کی پربہار زردی--- چائے کی میزیں، ادیبوں کے چہرے، نیچے فرش بھی اور اوپر عرش بھی--- زردی کی لامبی انگلیوں نے اور باگی نور نے ہر شے کو متاثر کر دیا۔ رسول کے سُرخ و سپید چہرے پر بھی جیسے ڈوبتے سورج کی کرنیں تھیں۔ یہ عشق تھا، علم تھا یا الہام تھا--- یہ سب کچھ پل دو پل کا کھیل تھا--- زردی جس طرح کھلی تھی اسی طرح نچڑتی چلی گئی لیکن دھوپ سفیدی کی جانب نہ لوٹی بلکہ اُس میں نیلاہٹ ایسے کھلی جیسے نیل کھل رہا ہو--- اور نیلاہٹ میں پانیوں کی روانی اور گیلاہٹ آ گئی--- پامیر کے سائے میں جھیل کرومبر کے نیل و نیل پانی جن کے کنارے قد آدم گھاس میں مَیں چلتا تھا--- جہاں ایک نکون میں گھاس سیاہ ہوتی تھی اور میرے لب اس پر تھے، اُس کی گھنی مہک سے میں مست ہوتا تھا--- اور اس گھاس میں شاید وہ بوٹا ہو جو من موہتا اور شام سلونا ہو---

سکردو کی جانب پرواز کرتے ہوئے ایک ایسی ہی جھیل نظر آئی تھی--- جہاں کسی بھی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا تھا--- اور میں وہاں پہنچنا چاہتا تھا---

نیشنل لائبریری کا ٹیرس جھیل کرومبر کی نیلاہٹ میں کھل رہا تھا--- اس کے برفیلے پانی کی ندیاں میرے بدن پر بہتی تھیں---

جب میں کانفرنس ہال میں داخل ہوا تھا تو رسول اپنی نظم "عورت کے لئے" پڑھ رہا تھا---

میں نے اُس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "رسول، میرے اندر منظروں کی ہوس ختم نہیں ہوتی--- چشمے خشک نہیں ہوتے، چراگاہوں کی ہریاول برسوں قائم رہتی ہے۔ برف زاروں کی یخ بستگی میرے بدن کو سرد نہیں کر سکی--- ہر صبح میری انگلیوں میں سے اُن پانیوں کی مہک آتی ہے جنہیں مدتوں پہلے میں نے چھوا تھا--- یہ ہوس کب ختم ہوگی؟"

"کبھی نہیں---" اس نے میری ہتھیلی کی پشت کو سہلایا "یہی ہوس تمہیں لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہیں ایسی قوت دیتی ہے جو دوسروں کے پاس نہیں--- اور میں تمہیں رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، تم ایک خوش نصیب شخص ہو---"

"وہ میں ہوں---"

"لیکن---" اُس نے میرے رخسار کو تھپکا "تم سے زیادہ نصیب والے وہ منظر ہیں جن کے حصے میں تم آئے ہو--- تم جس چشمے پر جُھکے جس آبشار کی پھوار میں سے گزرے جس جھیل کے پانیوں میں انگلیاں ڈبوئیں۔ وہ تم سے زیادہ خوش نصیب ہیں---"

رسول حمزہ توف پر شاید عمر اثرانداز ہو چکی تھی۔ وہ عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا---

اور وہ جھیل میری جانب آ رہی تھی جو میرا اوّل آخر تھی اور جس کی میں نے خواہش کی تھی اور اس خواہش کا آغاز کہاں اور کب ہوا تھا؟--- نذیر صابر کی میز پر---

میں اُس کے دفتر میں تھا۔ وہ میز کے اُس جانب اُن بلندیوں کی کہانیاں سناتا تھا جو کبھی اُس کے قدموں کے نیچے آئی تھیں اور میں میز کے اس جانب کے تُو پر قدم رکھنے والے دوسرے پاکستانی کو تکتا تھا اور میری نظریں بار بار میز پر بجے نیوایئر کارڈز پر سفر کرتی تھیں اور--- وُہیں پر وُہ جھیل تھی--- پیرس سے پوسٹ کئے ہوئے اُس کارڈ پر ایک جھیل کی تصویر تھی--- پاسکل کی آنکھوں کی نیلاہٹ والی ایک ایسی جھیل جس کے کناروں پر قد آدم گھاس بلند ہوتی تھی اور اس گھاس میں پُھول تھے اور کہیں جو بلند پہاڑ تھے اُن کی برفوں کے لئے اُس کے پانی آئینے تھے---

"یہ--- فرانس میں ہے؟" میں نے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"جی---" نذیر صابر کو پہاڑوں سے اُتر کر میز پر رکھے کارڈ تک آنے میں کچھ دیر لگی "نہیں، پاکستان میں ہے---"

مجھے دھچکا سا لگا--- میں پاکستان کی بیشتر جھیلوں کو جانتا تھا--- اگر اُن تک پہنچا نہیں تھا تو اُن کے سراپے سے آشنا تھا--- یہ کون تھی اور کہاں تھی جسے میں نہیں جانتا تھا--- "کہاں؟"

"وادیٔ اشکومن سے پرے ایک وادی سوئج نام کی ہے--- اور پھر وادیٔ کرومبر آتی ہے--- چھوٹے پامیرز کے دامن میں--- افغانستان کی واخان پٹی کی قربت میں--- جھیل کرومبر۔"

وُہیں سے اِس عشقِ خاص کا آغاز ہوا تھا--- نذیر صابر کی میز سے---

وُہی جھیل اب میری جانب آ رہی تھی--- اُس کے پانی شفاف تھے اور اُن کی تہہ میں جتنے پتھر تھے، وہ سب دکھائی دیتے تھے اور اُن پتھروں پر کیا کیا رقم تھا--- جدائی اور ناآسودگی کی تحریریں--- جنہیں پڑھنے کے لئے جھیل کے کناروں پر جھک کر پانی کی لہروں کو ختم کر کے جھکنا پڑتا تھا--- اُن پر کیا کیا رقم تھا--- پانیوں کے ساتھ آنسو آتے تھے--- اُن پتھروں پر کندہ عبارتوں کو پڑھنے کے لئے پوری زندگی درکار تھی کیونکہ اُن پر پوری زندگی رقم تھی---

"تم نے میری تازہ نظم پسند کی؟" رسول نے پوچھا---

"میں جب ہال میں داخل ہوا تو آپ اُس کا آخری بند پڑھ رہے تھے--- میں پُوری نظم نہیں سُن سکا۔"

"سنو گے؟"

"کیا آپ میرے لئے وہ نظم سنائیں گے؟"

"ہاں، میں ایک خوش نصیب کے لئے--- جس کی پاپاخ ٹوپی بہت بلند ہے--- جو زورنا کے تار چھیڑنے سے اُن جذبوں میں مبتلا ہو سکتا ہے جو--- اس عمر رسیدگی میں بھی مجھ میں کروٹیں لیتے ہیں--- میں یہ نظم دوبارہ سُنا سکتا ہوں--- رئیسہ" اُس نے تاجکستانی ترچھی آنکھوں والی مترجم کو دیکھا جو شاید تاجکستان سے پہلی بار باہر آئی تھی اور باہر کی زندگی کی دھوپ اور ہوا کی تازگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی "تم ترجمہ کرتی جاؤ میرے دوست کے لئے--- مائی فرینڈ" اُس نے ایک بار پھر میرا ہاتھ تھاما اور تھپکا---

اور وقت کی اُس کترن میں--- جس میں--- نیشنل لائبریری کے ٹیرس میں اسلام آباد کی نیلگوں ہو چکی دھوپ میں میرے پُراشتیاق چہرے کو تکتا رسول حمزہ توف وہ نظم سناتا تھا اور نیلگوں ہو چکی دھوپ میں وہ ایک خیال، ایک خواہش کی طرح جو کہ وہ تھی--- متلاشی آہنگی کے ساتھ ہمارے قریب ہوتی تھی--- رسول نے مجھے رشک بھری نظر سے دیکھا--- شاید اُس میں تھوڑا سا حسد بھی شامل تھا کہ اُس نے اپنی اسّی برس کی زندگی میں اتنی قید کر دینے والی جھیل نہیں دیکھی تھی--- اگر وہ اُسے دکھائی دے رہی تھی تو--- اُس نے اپنی نظم کا پہلا بند پڑھا---

"عورت---
اگر ایک ہزار مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو---
یقیناً رسول حمزہ توف اُن میں سے ایک ہو گا---"

ہاں' اس کشش کی کوئی قید نہیں--- محبت اور آوارگی کی کوئی قید نہیں--- ایک عورت کے لئے اگر ایک ہزار مرد خواہش کرتے ہیں' ایک ان چھوئی وادی یا جھیل کے لئے اگر ہزاروں آوارہ گرد خواہش کرتے ہیں تو کسی ایک فرد کی خواہش کم تو نہیں ہوتی---

"اگر ایک سو مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو---
رسول حمزہ توف--- اُن میں--- ظاہر ہے ضرور شامل ہوگا---"

وہ جھیل بھی تو اس آوارہ گرد کی خواہش کرتی ہے کہ وہ آئے اور اُسے دریافت کرے--- اُس کے پانیوں میں مل کر ایک نئی اور انوکھی مہک کو وجود میں لائے--- کسی ایک آوارہ گرد کے لئے---

"اور اگر دس مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو--
رسول حمزہ توف اُن میں سے ایک ہوگا---
اور اگر---
صرف ایک مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہو تو---
تو وہ رسول حمزہ توف کے سوا اور کون ہو سکتا ہے---"

کانفرنس ہال میں سب کا خیال تھا-- گزیا صورت لڈمیلا کا' توفیق اور عبداللہ حسین کا--- کہ یہ آخری بند ہے' مقطع ہے-- اور ہال میں تالیاں ایک سمندری شور کی شدت سے بلند ہوئیں لیکن رسول اپنا ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے-- نظم ابھی باقی ہے---

"اور اگر تم تنہا ہو--- اکیلی ہو
اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں ہے--
تو یقین کر لینا کہ--
کہیں بلند پہاڑوں میں-- رسول حمزہ توف-- مر گیا ہے--"

شام

"کہیں دنیا کی چھت کے آس پاس---- ڈھلتی شام میں"

کہیں بلند پہاڑوں میں---
کہیں دنیا کی چھت کے آس پاس---
کوہ پامیر کو جانے والے کوہستانی درّوں کی قربت میں---
وادیٔ اشکومن کی آخری حدوں پر' ورگوتھ گلیشئر کے قدموں میں---
درہ چیلنجی کی برف نزدیکی میں---
دریائے شین کی لگام میں تڑوانے والی پُرشور وحشت کے کنارے--- ایک ڈھلتی شام میں--

سارے دن کی کوہ نوردی کی مشقت سے آزردہ بدن کی تھکاوٹ میں ٹوٹتے ہوئے میں نے اپنے اوپر سایہ کرتی اس چٹان کو سر اٹھا کر دیکھا جو پچاسی درجے کے زاویے پر مجھ پر بلند ہو رہی تھی---

اور اس چٹانی دیوار میں کہیں کہیں پتھر اٹکے ہوئے تھے اور یہ سنگریزوں سے بھری بُھربُھری مٹی سے بنی تھی اور اُوپر--- میں نے اپنی آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر دیکھا--- اوپر جہاں دیکھنے سے دستار گرتی تھی وہاں ہمارا ایک پورٹر تکبیر خان کھڑا تھا--- اور مجھے اس پچاسی درجے کے زاویے پر-- اس عمودی بلندی پر چڑھنا تھا---

پہلو میں دریائے شین کے جھاگ آلود' پتھروں سے ماتھا پٹختے وحشی پانی ایک مہیب شور میں فنا کی قوت لئے پانی رواں تھے--- اور شام اُتر رہی تھی--

میں نے اپنی کوہستانی آوارہ گردیوں کے دوران متعدد بار اپنے آپ کو کوسا تھا اپنے آپ کو بدترین لفظوں سے پکارا تھا کہ تم یہاں کر کیا رہے ہو' اِدھر کا رختِ سفر کیوں باندھا تھا' کیا تکلیف تھی تمہیں کیونکہ--- سامنے جو کچھ نظر آتا تھا اس میں سب سے واضح شکل موت کی سیاہی کی ہوتی تھی--- پاسُو کے قریب دریائے برالدو پر ایک ڈھیٹھ

سپاٹ پر--- بیس کیمپ نانگا پربت سے واپسی پر--- وادیٔ رُوپل کے کناروں پر--- متعدد بار میں نے اپنے آپ کو کوسا تھا--- لیکن کہیں بھی موت ایک خدشے کی بجائے حقیقت بن کر سامنے نہیں آئی تھی---

اور یہاں وہ آئی تھی--

واپسی کے راستے بند تھے--- کیونکہ ہمارے پورٹرز آگے جا چکے تھے اور خیمے اور خوراک اُن کے کندھوں پر سوار ہمیں چھوڑ چکے تھے--- صرف تین چار پورٹرز ہماری مدد کے لئے رُکے ہوئے تھے--- مجھے یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک اس عمودی خوف پر چڑھنے کی کوشش میں ضرور گرے گا--- اور وہ نیچے منتظر پورٹرز یا ٹیم ممبرز پر نہیں--- سیدھا دریائے شین میں گرے گا--

میں نے اپنے آپ کو بہت ڈھارس دی--- ہمت بندھائی--- دانت بھینچ کر خوف کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بلندی جو مجھ پر سایہ کرتی تھی میرے لئے--- میرے آزردہ بدن کے لئے--- ایک ناممکن منزل تھی---

میں اس چٹان پر چڑھنے کے خطرے اور اس کی موت ہمسائگی کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں--- میرے پاس اب جب کہ میں اپنے گھر میں، ٹھنڈی کی عافیت میں--- نصرت فتح علی خان کا ــ میں جاناں جوگی دے نال--- سنتے ہوئے ایک تیز لیمپ کی روشنی میں اس سفر کی روئداد کو کاغذ پر اُتارتا ہوں تو ریفرنس کے لئے ایک تصویر میرے سامنے ہے--- ہمارا گائیڈ احد کسی ایک ممبر کو اس بھربھری اور پتھریلی دیوار پر کھینچے چلا جا رہا ہے--- اُوپر سورج کی آخری کرنوں میں دو پورٹرز تشویش سے نیچے دیکھ رہے ہیں کہ یہ پہنچتے ہیں یا نہیں اور نیچے دریائے شین کے خطرپانی اگرچہ تصویر میں ساکت ہیں لیکن اُن کا شور میرے کانوں میں اب بھی گونجتا ہے--- جو بھی اس تصویر کو دیکھتا ہے وہ تصویر کو بھی ایک ناممکن تصویر قرار دیتا ہے---

آپ کو اپنی ادبی زندگی میں اگر نصیب آپ کا ساتھ دیتا ہے تو بہت سارے پڑھنے والے ملتے ہیں جو آپ کو ناپسند کرتے ہیں، پھر بھی پڑھتے ہیں اور آپ سے نفرت کرتے ہیں--- اور بہت سارے ایسے ملتے ہیں جن کی زندگی میں آپ کی تحریر اُن کے لئے پہلی محبت کا درجہ رکھتی ہے اور ہر شخص کا جواز مختلف ہوتا ہے--- اُس ناممکن بلندی کے نیچے کھڑے--- خوف سے مسمار ہوتے بدن کے ساتھ--- مجھے خانہ بدوش آنکھوں والی ڈاکٹر سلطانہ کا ایک فقرہ یاد آیا--- مجھے تمہاری تحریروں میں جو موت کے ساتھ فلرٹیشن ہوتی ہے وہ اسیر کرتی ہے--- اُس نے میری بیشتر کتابوں میں سے فنا اور موت کی قربت میں

لذت اور خواہش کے احساس کو تلاش کیا تھا--- ہم دونوں کے درمیان جو رشتہ تھا وہ موت کا تھا--- امریکی لہجے میں اردو بولنے والی سلطانہ بھی موت کی آخری مسکراہٹ کو دیکھ چکی تھی--- لیکن یہاں---

وادیٔ اشکومن کی آخری حدوں پر--- درگوتھ گلیشر کے قدموں میں--- میں موت کے ساتھ ہرگز فلرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ مجھ پر نثار ہو جائے گی- مجھے آغوش میں لے لے گی--- فلرٹیشن کی حد سے آگے وہ صرف میرے ایک اشارے یا ایک قدم کی منتظر تھی-

"آئیں تارڑ صاحب---" ہمارے گائیڈ احد نے اپنا ہاتھ آگے کیا "آئیں اوپر چلیں---"

"نہیں احد--- کوئی اور راستہ تو ہو گا"

"نہیں---"

"یہ ناممکن ہے--- ہم گریں گے اور دریائے شین میں گریں گے اور--- کوئی پہچان نہ ہو گی--- نہیں"

موت کی قربت میں مختلف ردِ عمل اور خیال ہوتے ہیں- شاید کہیں ایک بے بس اطمینان یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد میں آپ کے پیارے اور عزیز آپ کو دیکھیں گے اور پھر مٹی کا ایک ڈھیر نشان ہو گا--- لیکن یہاں کسی نشانی کا--- کسی قبرستان میں ہر جمعرات کو اگربتیاں سلگانے کا کوئی موہوم سا امکان بھی نہ تھا کہ دریائے شین میں گرنے کے بعد--- آپ کائنات کا ایک حصہ بن جاتے تھے، کوئی نشان باقی نہ رہتا تھا---

میں یہ قائمی ہوش و حواس یہ کہہ سکتا تھا--- اس لمحے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اگر مجھے آنقل طور پر چڑھنا ہو--- ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت پر کھڑکیوں کے چھجے تھام کر آخری منزل تک پہنچنا ہو--- نانگا پربت یا کے ٹو کی چوٹی پر پہنچنے کی سزا سنا دی جائے تو شاید آزردگی اور خوف سے دوچار ہونے کے باوجود میں یہ رسک لے لوں--- کم از کم اُن کے نیچے ایک وحشی دریا تو منتظر نہیں تھا- لیکن یہاں تو مجبوری تھی--- خیمے اور خوراک آگے جا چکی تھی--- ہمیں بہر طور اس بلندی پر پہنچنا تھا یا نہیں پہنچنا تھا-

"آیئے تارڑ صاحب---"

میں اس لمحے دنیا کا بزدل ترین شخص تھا اور مجبور ترین بھی--- میں نے ہاتھ آگے کیا--- احد نے اُسے گرفت میں لے لیا--- دوسری جانب ایک اور پورٹر نے سہارا دیا--- میں نے اپنی زندگی کی ناکامیوں اور محبتوں کو یاد کیا--- جو کچھ مجھے عربی زبان میں یاد

تھا اُسے دوہرایا اور دیوار کے پہلے پتھر پر قدم رکھا--- میرے پیچھے ایک اور پورٹر خوشحال مجھے سہارا دیئے ہوئے تھا۔ وہاں قدم جما کر چڑھنے کا خدشہ ہی نہ تھا--- ایک عمودی بلندی پر جو قدم پڑتا ہے وہ اُسی لمحے کھسکتا ہوا نیچے جاتا ہے اور وہاں میرے پیچھے خوشحال اپنی ہتھیلیوں کے پیالے بنا کر میرے بوٹوں کی ایڑھیوں کو کچھ دیر کے لئے تھامتا تھا--- اتنی دیر کے لئے جتنی دیر میں مَیں انہیں اٹھا کر اگلی بلندی پر نہیں رکھ لیتا تھا--- جیسے کوئٹہ جانے والی ٹرین کے آگے پیچھے متعدد انجن لگے ہوتے ہیں ایسے میرے عقب میں اور دائیں بائیں تین انجن اپنی جان پر کھیلتے ہوئے مجھے اوپر دھکیل رہے تھے--- میرے بوٹ مسلسل کھسک رہے تھے اور مٹی اور سنگریزے ایک تسلسل کے ساتھ نیچے جا رہے تھے--- اگر صرف دریا کا شور نہ ہوتا تو میں زیادہ پُراعتماد ہو سکتا تھا--- نہ ہم کچھ بول سکتے تھے--- نہ ایک دوسرے کو کچھ کہہ سکتے تھے کہ کانوں میں دریائے شین کی جھاگ کا پتھروں کے ٹکرانے کا ایک ایسا شور تھا جس میں ہمیں سوائے موت بلاوے کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا--- اور شام کی زردی گہری ہو کر مردہ سی ہو رہی تھی۔ ہم سائے میں تھے اور اُوپر چوٹی پر دھوپ زرد تھی اور وہ بہت دور تھی--- پھر ہم اس زرد دھوپ کے قریب ہوتے گئے اور ابھی میں دھوپ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ میرے قدموں تلے پتھروں کا ایک مجموعہ جو جانے کب سے وہاں موجود تھا میرے بوجھ کی تاب نہ لا کر کھسکا اور میں کہیں بھی نہ تھا--- میرے قدموں تلے کچھ نہ تھا--- میرے مددگار اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں تھے اور پتھروں کے لڑھکنے سے جو شور ہو رہا تھا وہ دریا کے شور پر حاوی ہو رہا تھا--- میں شاید خلاء میں معلّق تھا--- بے بس--- بے وزن--- اور دریائے شین کا شور نیچے--- بہت نیچے مجھے بلاتا تھا--- خانہ بدوش نیلی آنکھوں کی فنا مجھے بلاتی تھی۔

پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے جا رہے تھے اور نیچے مجھے دیکھتے ہوئے میرے ساتھی، میرے ڈولتے ہوئے بدن کو تشویش سے دیکھتے اس آرزو میں تھے کہ میں اوپر پہنچوں تو وہ بھی اس آسمانی سیڑھی پر قدم رکھیں--- وہ یکدم پتھر آتے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہوئے--- اپنے آپ کو بچانے کے لئے--- پتھروں کے ہمراہ گرد بھی تھی--- اور پھر یہ لڑھکتے پتھر--- جو میری طرح بے بس ہو چکے تھے۔ اچھلتے ہوئے شین کے جھاگ آلود تیز پانیوں میں یوں روپوش ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں--- وہ دریا کی روانی کا ایک حصہ بن چکے تھے، اور اُن کا نشان مٹ چکا تھا--- احد کا ہاتھ پھر میری طرف آیا--- جیسے مائیکل اینجلو کی تصویر میں خالق کا ہاتھ آدم کی جانب بڑھ رہا ہے--- اگلے لمحے زرد دھوپ میری

آنکھوں میں اُتری اور میرا زرد چہرا روشن کیا--- ہم اوپر پہنچ چکے تھے۔

میرا حلق ستی کے صحراؤں کی طرح--- چولستان کی پارو شنی کی طرح--- اتنا خشک تھا کہ میں تھوک بھی نہیں نگل سکتا تھا۔

میرے اوپر پہنچ جانے پر پورٹرز نے تالیاں بجائیں--- اور میں اس عمودی بلندی پر ڈھیر ہوا، اور منہ کھول کر گہرے سانس لینے لگا--- میرے بدن میں ایک سناٹا اور خوف تھا اور اُس کی لرزش کم نہ ہوتی تھی--- میں نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں--- میں کس جگہ پر ہوں--- یہ کونسا مقام ہے اور مجھے اب کدھر جانا ہے-- میں صرف یہ جانتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ میں نے ایک ایسے ٹریک پر آنے کی حماقت کی تھی جہاں شاید ہی کوئی آیا ہو--- میں نے جان بوجھ کر ایسے راستوں پر چلنے کی آرزو کی تھی جن پر کسی اور خانہ بدوش کے قدموں کے نشان نہ ہوں--- تو مجھے اس کی قیمت تو ادا کرنی تھی-- لیکن یہ قیمت بہت زیادہ تھی-- بہت بعد میں--- برسوں بعد، ایسے لمحے جن میں آپ نے موت کو قبر کی مٹی کی قربت تک دیکھا ہو--- بہت بعد میں، وہ آپ کے لئے مسرت اور فخر کا سامان ہوتے ہیں کہ ہاں--- میں وہاں تھا اور بچ کر آگیا--- لیکن دریائے شین کی اس ڈھلتی شام کو آج بھی جب میں یاد کرتا ہوں تو مجھے کوئی مسرت نہیں ہوتی--- میرے لئے یہ ایک پُرفخر یاد نہیں بنتی-- اگرچہ اُس بلندی پر پہنچ کر جب میں اپنی لرزش پر--- سوکھتے ہوئے حلق اور بدن میں گردش کرتے لہو کی آہستگی پر بے بس ڈھیر ہوا تو مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں-- لیکن وہاں میرے ہانپتے ہوئے منہ کی قربت میں، میری آنکھوں کے سامنے زرد دھوپ میں ایک زرد پھول تھا--- یہ کہاں سے آگیا-- زرد دھوپ میں اس بلندی پر، دریائے شین کے پس منظر میں--- مجھے دیکھتا تھا-- شاید اسی نے میری خیریت کی دُعا مانگی تھی-- میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اُسے چھوا، توڑا، اور اپنے رُک سیک کی جیب میں رکھ لیا---

میری ٹیم کے ممبر ایک ایک کر کے اُوپر آرہے تھے، پورٹرز کی مدد سے، احتیاط اور آہستگی سے اُوپر آ رہے تھے۔

نوید--- جو اپنی منگیتر کے حُسن سے جُدا ہو جانے کے خوف سے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اُوپر آتا تھا--- خاموش طبع اور خوش شکل نوجوان، بڑا اعتماد اور سر جھکا کر چلنے والا شخص--- جو اپنے میرپوری تشخص پر نازاں تھا، پنجابی بولتا تو خالص کسی دہقان کی طرح، اور انگریزی تو کسی بھی عام پب میں مخمور انگریز سے بہت بہتر---

خالد ندیم--- جو "کے ٹو کہانی" میں تھنگل کے گلابی کھیتوں میں خیمے کی گھٹن کا

شکار ہو کر ڈاکٹر عمر کے فیصلے پر سر جھکائے چپکے سے جیپ میں سوار ہوا اور واپس سکردو چلا گیا تھا---

شاہد عزیز-- اپنے خوف پر پردہ ڈالے بظاہر بے خوفی سے اُوپر آ رہا تھا۔

میاں فرزند علی--- دُبلا اور پھُرتیلا بدن جو تناؤ میں آئی ہوئی ایک پتنگ کی طرح اس بلندی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا--

بقاء شیخ--- ملتانی سوہن حلوے کی مٹھاس سے گندھا شخص-- کھانا پکانے اور قہقہے لگانے کا شوقین-- کم سنتا تھا اور اسی لئے نیچے گرجتے دریا سے لاتعلق مسکراتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔

اور خالد ملتانی--- جیک نکلسن ایسی ذو معنی مسکراہٹوں والا بندہ--- اپنی "متاع" کو سینے سے لگائے پھسلتا سنبھلتا اُوپر پہنچ رہا تھا--

جب آخری ممبر اوپر پہنچا تو دریائے شمشال کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی--- ہم اس کی روانی کا حصہ بننے سے بچ نکلے تھے۔

اور جب آخری ممبر اوپر پہنچا تو اوپر ڈھلتی دھوپ کی زردی میں--- ورگوتھ گلیشئر کے سائے میں-- دنیا کی چھت کے آس پاس-- دریا کے وحشی شور میں-- ایک جشن برپا تھا-- پورٹر، گائیڈ، کک، اور ہم سب--- کم عقل اور حواس باختہ لوگوں کی طرح شور مچا رہے تھے--- کہ ہم زندہ تھے۔

"چلیں تارڑ صاحب---" احد نے اپنی پُرکشش مسکراہٹ کا بھرپور استعمال کیا "آج رات ہم ورگوتھ گلیشئر کے عین نیچے ایک جنگل میں گزاریں گے اور وہاں ندیاں ہیں، اور مارخور کا گوشت ہمارا منتظر ہے۔"

کِم اونیل نے گلگت میں کہا تھا "مستنصر! جب تم ورگوتھ گلیشئر کے عین نیچے ایک جنگل میں اپنے خیمے لگاؤ گے--- اگر تم وہاں پہنچ جاتے ہو تو-- اگلی صبح پانچ بجے بیدار ہونا اور اُوپر جہاں ورگوتھ گلیشئر کی برفیں ہیں اُن کے اختتام پر ایک گھنا جنگل ہے، وہاں ضرور جانا-- صرف ایک گھنٹے کی چڑھائی ہے-- اور اُس گھنے جنگل میں بہت کم کوہ نورد گئے ہوں گے-- وہاں سویرے سویرے ایک درخت سے دوسرے درخت پر ایسے پرندے اُڑان کرتے ہیں جو تم نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے-- میں نے اُن پرندوں کی تصویریں کسی بھی برڈ انسائیکلوپیڈیا میں نہیں دیکھیں-- ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اُس لمحے تمہارے لئے بنا کر وہاں چھوڑ دیئے گئے ہوں-- اُن کی رنگ دار دُمیں پرواز کے دوران ہماری ناک کو چھو کر گذر جاتی ہیں--- اور اُن کی آوازیں، ایسی کہ صرف پہلی محبت میں

سنائی دی ہوں گی-- وہ اُن زبانوں میں چہچہاتے ہیں جو ابھی ایجاد نہیں ہوئیں--- تم سویرے سویرے اُس جنگل میں ضرور جانا۔"

تو ہم اُس پچاسی درجے کی زاویئے کی چٹان کو عبور کر چکے تھے اور ہمارے سامنے آج کی شام میں ورگوتھ جنگل کی خیمہ بستی تھی-- جس کے اوپر-- ورگوتھ گلیشئر کی سفیدی کی قربت میں وہ جنگل تھا جس میں رنگین دُموں والے پرندے ہمارے منتظر تھے۔

ہم موت کو بھُول گئے-- اُسے ہم نے جُل دے دیا تھا-- اور ورگوتھ جنگل کی خواہش میں-- حواس باختہ اور پُرمسرت چلنے لگے----

اگر کوئی بھی تمہارے عشق میں مبتلا نہیں تو----

کہیں بلند پہاڑوں میں---

بشام

"بشام میں شام"

وہاں جہاں دھوپ کم ہو رہی تھی اور شام کی سیاہی اُتر رہی تھی اور پہاڑ نزدیک ہوتے ہوتے ایک تنگ درّے کی صورت بے آرامی کی کیفیت میں مبتلا کرتے تھے وہاں مانسہرہ اور بٹ گرام سے پرے، بشام کے راستے میں شاہراہ قراقرم پر، دریا کے عین اُوپر تقریباً دو فرلانگ سڑک--- نیچے دریا میں جا چکی تھی--

سینکڑوں بسیں، ویگنیں، کاریں اور ٹرک قطار اندر قطار جدید دور کی مشینوں کی بے بسی کی تصویریں بنے ساکت کھڑے تھے--- اور پچھلے کئی دنوں سے ساکت کھڑے تھے--

بادشاہ خان نے ویگن روک دی "صاحب میں نے بولا تھا کہ بشام سے اودھر-- روڈ بلاک ہے--"

اسلام آباد میں ناٹکو والوں نے، اشرف امان اور نذیر صابر نے اور اُن ڈرائیوروں نے جو گلگت سے راولپنڈی آتے جاتے تھے مجھے یہی کہا تھا کہ وہاں جہاں دھوپ کم ہوتی ہے اور پہاڑ نزدیک ہو کر بے آرام کرتے ہیں وہاں دریائے سندھ سے چند کلومیٹر اودھر سڑک دریا میں گر چکی ہے-- لینڈ سلائڈ کے باعث روڈ بلاک ہے--- ابھی مت جائیں-- کھلنے کا انتظار کریں--- لیکن میں اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ اور ہوا میں سے نکل جانا چاہتا تھا--- بے شک مجھے وہاں جہاں دھوپ کم ہوتی ہے اور شام کی سیاہی فوراً اُتر آتی ہے وہاں شب بسر کرنی پڑے لیکن میں اسلام آباد سے نکل جانا چاہتا تھا-

اس راستے میں--- مانسہرہ سے آگے شاہراہ قراقرم کے آس پاس جتنے موڑ تھے اور درخت تھے اور چاول کے کھیت ہرے کچور تھے وہ سب مجھے ازبر ہو چکے تھے اور وہاں پر وے سائیڈ ہوٹلوں میں بے شمار ٹرک ساکت کھڑے تھے اور اُن کے ڈرائیور اطمینان سے جہازی چارپائیوں پر سوتے تھے یا اپنے بدن کے مختلف حصے کھجاتے ہوئے وقت

گزارتے تھے اور ہمیں--- ایک اسلام آباد سے آتی ہوئی ویگن کو بشام کی جانب بڑھتے دیکھتے تھے اور مسکراتے تھے کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ وہاں آگے کئی روز سے سڑک بلاک ہے اور ہم یہاں اگر ساکت کھڑے ہیں تو اس کا جواز ہے اور اگر اُدھر سے نہ کوئی شے آ رہی ہے اور نہ جا رہی ہے اور سڑک کرفیو زدہ ویرانی کی زد میں ہے تو اس کا جواز ہے اور پھر بھی یہ احمق ویگن میں سوار فراٹے بھرتے ہوئے اپنے تئیں بشام کی جانب رواں ہیں- لیکن--- میں جانتا تھا کہ آگے تھاکوٹ سے ذرا اودھر ایک سائے میں آیا ہوا پہاڑی سلسلہ ہے جہاں اکثر چٹانیں بارشوں کے بعد کھسکتی ہوئی نیچے آتی ہیں اور اسلام آباد اور گلگت کے درمیان اس شہ رگ کو منقطع کر دیتی ہیں--- میں جانتا تھا اور اس کے باوجود سفر کر رہا تھا--- اس لئے کہ میں اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ میں زندگی کا ایک اور دن ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا--

ہم ویگن سے باہر آ گئے---

جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک ویگنیں، بسیں، کاریں اور ٹرک یوں بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے ان کے انجن نکال لئے گئے ہوں اور وہ صرف ڈھانچے ہوں-- ایسے کھلونے ہوں جن کی چابی ختم ہو گئی ہو- کہیں آگے سڑک کا وہ حصہ تھا جو دریا میں گر چکا تھا--- مسافت کرنے والے لوگ اس تلخ حقیقت سے سمجھوتہ کر چکے تھے کہ اب انہیں یہیں زندگی کرنی ہے--- نیچے دریا میں نہا رہے تھے- پتھروں پر سو رہے تھے اور عورتیں بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں- کچھ مہم جُو ذہن اپنا مختصر سامان اٹھائے اُوپر پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش میں تھیں کہ شاید ہم گری ہوئی سڑک کے دوسری جانب اتر جائیں اور پھر وہاں سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں--- لیکن یہ تکنیک صرف تنہا مسافر آزما سکتے تھے اور وہ بھی جن کے پاس بوریا بستر ذرا مختصر ہو--- ان میں سے بھی اکثر واپس آ جاتے کیونکہ چڑھائی بے حد خطرناک تھی---

کوہ پیما اور پولو کے کھلاڑی ہنزہ کے کرنل شیر خان بال بچوں سمیت جمائیاں لے رہے تھے اور اپنی بھوری مونچھوں کو تاؤ دیتے دیتے اُکتا چکے تھے- مجھے دیکھ کر قدرے بحال ہوئے "واہ تارڑ صاحب کبھی آپ سے صدارتی محل میں ملاقات ہوتی ہے اور کبھی کسی لینڈ سلائیڈ کے موقع پر--- کہاں جا رہے ہیں؟"

"ابھی تو کہیں نہیں جا رہے-"

"دُرست--- ہم دونوں یہاں لاچار اور بے بس ہیں-- پتہ نہیں لینڈ سلائیڈ کب کلیئر ہو گی- شنید ہے کہ آج رات تک امکان ہے-"

ملک صاحب۔۔ فلنگ راڈ والے۔۔ ایک چٹان پر اطمینان سے بیٹھے تھے۔۔ ایک مچھلی کے شکاری کے اطمینان سے "دو دن سے اسی حالت میں بیٹھا ہوں۔۔ ایک گروپ کو کنکورڈیا لے جا رہا تھا۔۔ اور یہاں یہ لینڈ سلائیڈ۔۔۔"

بی۔بی۔سی ٹیلی ویژن کا اسلام آباد کا نمائندہ ڈینئل لیک۔۔۔ لیکن وہ بہت خوش ہے "میرے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ ہے۔۔۔ پچھلے دو روز سے سڑک بند ہے۔۔ اور میں چھٹی پر ہوں۔۔ مجھے اپنے دفتر صرف ایک فیکس روانہ کرنی ہو گی کہ۔۔۔ سوری پاکستانی شمال میں راستے بلاک ہو چکے ہیں میری چھٹی بڑھا دی جائے۔۔۔"

وہ بھی کنکورڈیا جا رہا ہے۔۔۔

آرمی بل ڈوزر قدرت کے ساتھ ماتھا لگائے پہاڑ میں ایک راستہ بنانے کی تگ و دو میں۔۔۔ انسان نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔۔ قدرت اپنے پہاڑ اور پتھر کھسکاتی ہے اور وہ نیچے دریا تک جاتے ہیں اور انسان ہار نہیں مانتا۔۔۔ کبھی تھوڑا سا راستہ وجود میں آتا ہے اور اسی لمحے کیچڑ اور پتھروں کا ایک اور سیلاب بل ڈوزروں کے اوپر گرتا ہوا سڑک کو پھر بلاک کر دیتا ہے لیکن انسان ہار نہیں مانتا۔ بل ڈوزر کے بلیڈ سر جھکاتے ہیں اور پھر سے پہاڑ میں راستہ بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

ایک دنیا ہے۔۔۔ ایک بڑے قصبے جتنی آبادی ہے جو بے بسی کے عالم میں ویرانے کو آباد کرتی ہے۔۔۔

شام گہری ہوتی جاتی ہے۔۔۔

میں دریا کے کنارے نیچے ایک ہموار جگہ کو نظر میں رکھتا ہوں کہ یہاں شب بسری کے لئے خیمے نصب کئے جا سکتے ہیں۔۔۔ وہاں تک پہنچنا مشکل ہو گا۔ وہاں جگہ بھی بہت کم ہے لیکن اسلام آباد کی بے رُوح دھوپ میں واپس جانے سے تو یہ بہتر ہے۔۔

اور جب تاریکی بڑھنے لگتی ہے۔۔ کاروں اور ویگنوں کی ہیڈلائٹس روشن ہو کر اسی ویرانے کو عجیب ڈرامائی شکل دینے لگتی ہیں۔۔ ہم طے کر چکے ہیں کہ خیمے کہاں ہوں گے اور خوراک کے لئے چولہا کہاں روشن ہو گا۔۔ تب اس عارضی قصبے کے مکینوں میں ایک سرگوشی سفر کرتی ہے کہ شاید رات نو بجے تک روڈ کلیئر ہو جائے۔۔ ہم اپنی ویگن سے اتارا ہوا سامان پھر سے لوڈ کرنے لگتے ہیں۔۔۔ دو گھنٹے بعد روڈ بلاک کی قربت میں چند جیپیں اپنے انجن گرم کرنے لگتی ہیں۔۔ ایک عارضی راستہ وجود میں آ چکا تھا۔۔۔ ہر کوئی اپنی سواری کی جانب دوڑنے لگتا ہے۔۔ جیسے ٹرین چھوٹنے کا خوف ہے۔۔ اندھیرے میں لوگوں کو اپنی ویگنوں اور کاروں کو تلاش کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔۔ چند لمحوں میں

تمام ہیڈلائٹس روشن ہو جاتی ہیں۔۔ انجن دھواں چھوڑنے لگتے ہیں اور ہارن بجنے لگتے ہیں لیکن۔۔ روڈ بلاک پر ایک عارضی راستہ وجود میں آ چکا ہے اور آرمی انجینئرز فیصلہ کر رہے ہیں کہ کیا اس پر سے ٹریفک کو گزرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔۔ کہیں اس دوران اوپر سے پتھروں اور کیچڑ کا سیلاب نیچے نہ آ جائے۔۔۔ راستہ کھل جاتا ہے لیکن اس پر سے گزرنے کا اولین حق دوسری جانب رُکی ہوئی ٹریفک کو دیا جاتا ہے۔۔۔ ان میں ایسی بسیں تھیں جن میں بچے بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے اور خواتین نے اپنے آپ پر جبر کر رکھا تھا۔۔۔ وہ ان معاملات کے لئے کہاں جائیں! دریا کے کنارے، سڑک پر ہر سو آبادی تھی کوئی پرائیویٹ جگہ نہ تھی۔۔ ان میں سے کچھ عورتیں اس روڈ بلاک کو عبور کرتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔۔۔ اور کچھ یا علی یا علی کے نعرے لگا رہی تھیں۔۔۔ اور وہ مستحکم تھیں اس یقین میں کہ آئندہ کبھی شمال کا رُخ نہ کریں گی۔

عارضی راستہ ٹریفک گزرنے سے مزید عارضی ہوتا چلا جاتا تھا اور ہمیں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ہماری باری آنے تک روڈ پھر سے بلاک نہ ہو جائے۔۔۔ بالآخر ہماری باری آ ہی گئی اور ہماری ویگن ناہموار پتھروں اور کیچڑ میں بَل کھاتی بادشاہ خان کے پختہ کار ہاتھوں میں تھامے سٹیئرنگ کے زور سے اس روڈ بلاک کو عبور کر گئی۔۔۔

ایک ایسے اطمینان کے سانس جیسے سب کو نئی زندگی مل گئی ہو۔۔۔ لیکن خوف ابھی تک بدنوں میں۔۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔۔

اور آگے۔۔۔ شیر دریا سندھ تھا۔۔

تھاکوٹ تھا۔۔۔ یا ہے۔

ایک گہری آسودگی کے ساتھ میں نے اندھیرے میں مجھ تک آتی شیر دریا کی گونج سُنی جو قریب آ رہی تھی اور پھر ہم اس شاندار پُل پر سے گزرے جس کے نیچے شیر گونجتا تھا اور ہم دوسرے کنارے پر بشام کی جانب سفر کرنے لگے۔۔

ہم جو ایک ایسی ذہنی حالت میں تھے کہ روڈ بلاک کے کنارے ایک تاریکی میں رات بسر کرنے پر رضامند ہو چکے تھے اب بشام کی طرف بڑھتے تھے تو قدرے آزردگی اور بے سود تمنا کے ساتھ کہ وہاں کے موٹل میں روڈ بلاک کی وجہ سے جانے ہمیں رہائش نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔۔۔ اور پھر سفید ساگر کے کنارے موٹل کی روشن عمارت سنڈریلا کے خواب محل کی طرح دکھائی دینے لگی۔۔ کیا وہاں ہمارے لئے جگہ ہو سکتی ہے!

اور وہاں۔۔۔ شیر ستان تھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ آئیں اور ہم آپ کو چھت اور سایہ نہ دیں۔۔۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے؟ اور آپ خوش نصیب ہیں کہ روڈ بلاک عبور کر آئے ہیں۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ روڈ پھر بلاک ہو گئی ہے۔"

پی۔ٹی۔ڈی۔ سی موٹل کا کمرہ نمبر ۲۳ میرا پسندیدہ تھا۔۔۔ اس کا ٹیرس دریائے سندھ پر کھلتا تھا۔۔۔

"ہیلو سندھ۔۔۔" میں نے اُسے ایک دوست کی طرح پکارا۔۔۔ جواب میں اُس کی گونج بلند ہوئی۔

سندھ

"سندھ ساگر کے کچے دھاگے"

وہ لوگ۔۔۔

جو دمشق کے کسی قدیم کوچے میں ایک کھڑکی کھلتے دیکھتے ہیں۔۔۔

جو وینس کی آبی گلیوں میں ہونٹوں سے محبت تلاش کرتے ہیں۔۔۔

جو قرطبہ کی شاموں میں "کبلا روخو" میں شاگریا کی سرخی ایک لبنانی چہرے پر دیکھتے ہیں۔۔ جو دریائے خراج کے کنارے ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو اپنی محبوبہ کو سامنے بٹھائے حافظ کی غزلیں سنتا ہے اور اس کے گرد رقص کرتا ہے۔

جو ٹمپ میدان میں داخل ہوتے ہیں اور نانگا پربت پر سے برف کے تودے گرنے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

یا کنکورڈیا کی سویر میں شاہ گوری کے برفیلے بدن کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں۔۔۔

صرف وہ لوگ جان سکتے ہیں کہ شیر دریا سندھ کے کنارے۔۔۔ ایک نیم چاندنی شب میں۔۔ جب اُس کے پانی تھم جاتے ہیں تو بندے کے اندر کیسی کیسی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔۔ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں کہ بشام کی ایک نیم چاندنی شب میں سندھ ساگر کے کنارے جب آنکھیں خواہش اور اداسی کی اُس کروٹیں بدلتی چادر کو تکتی ہیں اور آرزو کے ایک تسلسل سے تکتی ہیں جو اُس کے پانیوں کی روانی ہے تو کیسے ایک بندھن وجود میں آتا ہے۔۔ دریا کی گونج مدھم ہونے لگتی ہے اور آپ کی گردشِ خون اُس سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور پھر ہر لمحے میں کچے دھاگے کی ایک ڈور روانی کی چادر میں سے اُدھڑتی ہے الگ ہو کر آپ کے بدن تک آتی ہے اور اُس سے لپٹتی ہے۔۔ پھر ایک اور ڈور۔۔۔ ایک اور دھاگہ۔۔ اور یہ دھاگے وہ ہیں جو کبھی رُوح کی چادر کا ایک حصّہ تھے، پھر بے امنی، بے چینی، انسانی کمینگی اور خواہشِ دنیا ان دھاگوں کو نوچ دیتی ہے اور رُوح کی چادر میں جگہ جگہ خالی دھاریں دکھنے لگتی ہیں۔۔۔اس نامکمل ملبوس میں انسان اس لئے

آزردہ ہوتا ہے کہ اُس کی تیاری نامکمل ہوتی ہے--- قبر کی مٹی میں جو لباس درکار ہوتا ہے اُس میں اگر خالی دھاریں ہوں تو اُن کے راستے کیا کیا عذاب نہ داخل ہوں گے--- چنانچہ وہ اِس جستجو میں رہتا ہے--- اسے اپنے خالی پن اور بدن کی درزوں میں سے، مرگ کی سرد سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں-- وہ چاہتا ہے کہ اُس کی تیاری مکمل ہو اُس کا لباس حاضری دینے کے لائق ہو--- صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں--- چنانچہ اُس نیم چاندنی میں--- بشام ہوٹل کے ٹیرس پر بیٹھے جب کہ میری آنکھیں خواہش اور اداسی کی کروٹیں بدلتی چادر پر رکھی تھیں وہاں سے وہ دھاگے مجھ تک آتے تھے اور جہاں جہاں میری چادر میں دھاریں تھیں، خلا تھا اُسے پُر کر رہے تھے--- دریا کی گونج گویا کھڈی کی کھٹ کھٹ کی طرح وہ ردھم تھی جو تانے پیٹے کو بُنتی تھی مجھے مکمل کرتی تھی--- رات بھیگتی تھی اور اُس کی نمی سے کچے دھاگے کے ریشے پکے ہوتے تھے۔

"تارڑ صاحب آپ کبھی پورے چاند کی رات کو بشام آیئے---" شیر ستان کے تراشے ہوئے نین نقش پر میرے لئے جو محبت تھی وہ میری کسی اہلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کی خصلت کے حُسن کی وجہ سے تھی" پھر دیکھئے آپ کے ساتھ یہ دریا کیا واردات کرتا ہے-"

"نہیں--- اگر چاند کی ہلکی دھوپ ہوگی تو یہ دھاگے سب کو دکھائی دیں گے---"

"کونسے دھاگے؟" وہ میری گمشدہ کیفیت میں مخل نہ ہوا اور پھر چُپ ہوگیا۔ انسانی زندگی کے تسلسل کے علاوہ کل کائنات میں شاید دریا کی روانی ہے جو اُس کا ساتھ دیتی ہے- یہ رواں پانی سدھارتھا سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں--- موہنے کے لئے راستہ بناتے ہیں- سوہنی کی سرگوشیوں کے امین ہوتے ہیں--- پاروشنی کی پیاس بجھا نہیں سکتے لیکن اُسے بھی رُوح کی چادر مکمل کرنے میں مدد دیتے ہیں--

"اِس بار جنگل خواری کے لئے کدھر جا رہے ہیں؟"

"جھیل کرومبر کی طرف---"

"وہ کہاں ہے؟"

"چھوٹے پامیر کے کوہستانی سلسلے میں، داخان کے قریب کہیں ہے"

"ہے بھی یا نہیں ہے؟"

"یہی معلوم کرنے کے لئے تو میں جا رہا ہوں"

"اور اگر وہ وہاں نہ ہوئی تو؟"

"اس سے شاید آزردگی اتنی نہ ہو--- وجود اور شک دونوں یکساں طور پر زور آور ہیں- کیا پتہ کونسی ازلی حقیقت یا وجود وہاں ہے بھی یا نہیں جس کی طرف ہم سفر کرتے ہیں--- وہاں پہنچنے پر ہی معلوم ہوگا کہ فنا ہے یا بقاء--- تو اصل صرف اُس کی جانب سفر کرنا ہے- آرزو میں ہی مکمل تکمیل ہے- میری بقاء بھی اُس کے وجود، خیالی یا حقیقی کی طرف سفر کرنے میں ہی ہے"

"صاحب کھانا لگا دوں؟" اندھیرے میں ہوٹل کے کسی ویٹر نے دریا کے شور سے آواز بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں تارڑ صاحب؟"

"ابھی نہیں---"

"ابھی نہیں---" شیر ستان نے دوہرایا۔

شیر دریا لگ چھُپ لُگ چھُپ دُور نہیں کھینچتا تھا--- اس کے دھاگے نیم چاندنی میں سفید دِکھتے تھے--- جیسے چٹی دودھ چاندنی میں کوا بھی روئی کی پُونی کی طرح سفید ہو جاتا ہے-- میری چادر کی خالی جگہیں پُر ہو گئیں- خالی دھاروں میں گمشدہ تار بُنے گئے لیکن اس کے باوجود دریا کی چادر میں سے ایک اور دھاگہ اُدھڑا اور اُس کے اُدھڑنے سے بہت شور ہوا--- یہ دھاگا آیا اور میرے گرد لپٹا اور اس کی گرفت بہت مضبوط تھی، لیکن اس کے کھچاؤ سے دم نہیں گھٹتا تھا بلکہ زندگی کی پھونک بدن پر ہولے سے پھیلتی تھی۔

کیا میں تنہا ہوں اور کوئی بھی میری محبت میں مبتلا نہیں؟

ہاں یہ ایک تجربہ ہے جو نصیب والوں کے دل میں اُترتا ہے- یہ ایک مُشکی گھوڑا ہے جو داخستان میں نہیں بشام کی نیم چاندنی رات میں سندھ کی گونج میں بدن تھرتھراتا تمہارا منتظر ہے--- میں اکیلا کیسے ہو سکتا ہوں--- یہ لامبی لامبی انگلیوں کے سفید دھاگے جو مجھے میری چادر کو مکمل کر رہے ہیں- جیسے گاؤں کی سویر میں اُترتی نم ٹھنڈک میں شوقی کھیس میں سے کپاس کی تازہ مہک آتی ہے ایسی اس دھاگے میں خوشبو تھی- جھیل کرومبر کی قد آدم گھاس کی خوشبو--- میں نے ہتھیلی کو اپنی ناک پر رکھا تو انگلیوں میں یہی مہک رچی ہوئی تھی۔

سندھ کے اُس پار نیم سیاہ بلندی میں جو روشنیاں کہیں کہیں ٹمٹماتی تھیں اُن کے مکین اب سونے کی تیاری میں تھے اور وہ ایک ایک کرکے تاریکی میں گم ہوتی تھیں۔

وہ ہلکی گونج بھی پانی کے ساتھ گُم ہوگئی- اور ایک پل میں--- شاید ایک پل کے لئے ہر سُو مکمل خاموشی ٹھہر گئی- شاید سندھ کے پانی اُس پل کے لئے رُکے اور تھم

گئے--- اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنی آنکھیں اس کی سُرمئی چادر سے ہٹالیں کہ اس ایک پل کے سکوت اور ٹھہراؤ کے بعد میں جانتا تھا کہ یکدم شور بپا ہو جائے گا۔ دریا پتھروں سے ٹکراتا اپنی گونج سے عرش تک پہنچے گا اور دل میں آئندہ سفر کے وسوسے جگہ بنائیں گے۔ اگلی صبح کے سفر کی تیاری کی تشویش جنم لے گی اور--- سارے دھاگے ٹوٹ جائیں گے۔ ڈور منقطع ہو جائے گی لیکن اس سے پیشتر میں نے اپنی آنکھیں سندھ کی سُرمئی چادر سے ہٹالیں۔

اور اسی سکوت اور ٹھہراؤ اور اُن دھاگوں میں بندھا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

کل ہمیں گلگت پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے--- اس جھیل کی جانب جو شاید وہاں نہیں تھی۔

کُھلے دروازے میں سے چاندنی کا غبار کمرے میں آتا تھا اور اُس کی لَو میں میرے ہم سفر ساتھیوں کے ہیولے نظر آتے تھے جو سلیپنگ بیگز میں لپٹے کہ رات کے بھیگنے سے خنکی بڑھتی تھی، لپٹے نیند میں گم تھے۔ نیند میں تھے یا آئندہ سفر کے خواب میں تھے۔

پچھلی شب میں نے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا تھا---

پھر کنکورڈیا کی سویر اُس کا برف بدن دیکھا تھا--- ایسا دودھیا بدن جس پر نیل آسانی سے پڑ جاتے ہیں--

اور آج کی شب کس نے میرے خواب میں آنا تھا--

اور کیا میں اُسے بھی حقیقت میں دیکھوں گا یا کہیں بلند پہاڑوں میں--

کروٹیں بدلتا میں بہت بے آرام رہا۔ کمرے کے ایک کونے میں گھنی تاریکی میں کہیں میرا رُک سیک خواہش کے ترپوی فواڑے میں ایک بار پھر ایک ایسے تنکے کی طرح پڑا تھا جو اپنا نصیب نہیں جانتا تھا۔

میں کروٹ بدلتا تو ٹیرس پر کُھلتے دروازے میں سے دبے پاؤں داخل ہوتی لَو کے ساتھ دریا کی قربت کی ٹھنڈک میرے چہرے پر پھیلنے لگتی۔ کنکورڈیا جانے کے لئے میرے پاس خواہش کی آشفتہ سری کے ساتھ منزلوں اور راستوں کی تفصیل موجود تھی جو میں نے ٹریکنگ کی کتابوں کوہ نوردوں اور آوارہ مزاجوں سے ذرہ ذرہ جمع کی تھی--- کرومبر کی اس جھیل کے لئے میرے پاس صرف خواہش تھی۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو اس راستے پر چلا ہو--- جس پر میں چلنا چاہتا تھا--- نذیر صابر کی میز پر صرف ایک تصویر تھی-- اور ایک تصویر یہ بیان نہیں کر سکتی کہ جدائی کے ماہ و سال میں کتنے آنسو ہوتے

ہیں۔ کروٹیں بدلنے کی کتنی راتیں ہوتی ہیں--- ایسے ایک جھیل کی تصویر بھی یہ بتانے سے قاصر ہوتی ہے کہ اُس کے راستے میں کتنی برفانی دراڑیں تاریک اور سرد مُنہ کھولے منتظر ہیں۔ بلندیوں پر کتنے مقام ہیں جن پر قدم رکھنے سے پیشتر انسان اپنے پیاروں کو یاد کرتا ہے۔ کتنی پُرشور ندیوں میں اک دوجے سے ٹکراتے پتھر بدن کو کچلنے کی آرزو رکھتے ہیں اور کتنی پردہ پوش بلندیاں ایسی ہیں جو کوہ نورد کو نامحرم سمجھ کر نیچے دھکیل دیتی ہیں۔ یا پھر ایسا بھی ممکن ہے کہ پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ جھیل سامنے آ جائے۔ اس لئے ایک تصویر کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ صرف خواہش کو بیدار کر سکتی ہے۔ انسان کو خوار کر سکتی ہے---

میں نے "ہنزہ داستان" میں رتی گلی چوٹی کے راستے میں ایک ایسے میڈیکل سٹوڈنٹ کا تذکرہ کیا تھا جو اُن زمانوں میں جب گلگت اور ہنزہ صرف نقشوں پر نام تھے "نیشنل جیوگرافک" کے ایک شمارے میں ہنزہ کی ایک خوبانی رنگت ماہتاب صفت لڑکی کی تصویر دیکھ کر اس کے عشق میں مبتلا ہوا اور صرف اُسے ایک بار آنکھ بھر کر دیکھنے کے لئے تنہا گھر سے نکل پڑا تھا اور کاغان کے ویرانوں میں درہ بابو سر کی سمت میں ہنزہ جانے والے راستے کا متلاشی تھا--- مجھے اس عمر میں اُس سٹوڈنٹ کی نسبت زیادہ پختہ کار اور باشعور ہونا چاہئے تھا--- لیکن میں بھی صرف ایک تصویر کے عشق میں مبتلا ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مجھ میں اب تک وہ بلوغت اور شعور نشوونما پا چکا ہونا چاہئے تھا جب میں کسی ایسی تصویر کو دیکھ کر شاید ایک تحسین آمیز نظر اس پر ڈال کر اُسے ردی کی ٹوکری میں ڈالتا اور بھول جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا--- کہیں میرے دماغ میں، شعور میں، میری نشوونما میں کمی رہ گئی تھی--- میں کچا رہ گیا تھا اور عمر کے ان زوال برسوں میں بھی ایک تصویر میری خواہش بن جاتی تھی--- وہ سٹوڈنٹ بالآخر ہنزہ پہنچا اور اُس لڑکی کو آنکھ بھر کر تو کیا ایک نظر بھی نہ دیکھ سکا اور مایوس ہو کر لوٹ آیا--- جھیل--- تصویر کی جھیل بھی شاید میرے ساتھ یہی سلوک کرے--- جھیل--- بے خوابی اور خواب--- بدن کی تھکن خواب کی جانب اور واپس بے خوابی کی چوکھٹ پر--- مجھے نہیں علم کہ سندھ کی اُس نیم چاندنی شب میں--- اور اُس کی مدھم لَو میرے کمرے میں آتی تھی۔ میں سویا--- عارضی موت کی قربت میں سانس لیے یا جاگتا رہا۔ لیکن ایک خواب مسلسل ساتھ دیتا رہا--- رسول حمزہ توف کہہ رہا ہے، یہ محبت ہے--- اور کوئی میری طرف آ رہا ہے--- ایک جھیل کی نیلاہٹ کا رُوپ رواں ہونے لگتا ہے۔ میں اُس جھیل کے پانیوں پر جھکتا ہوں--- اور اُس کے شفاف پانیوں کی تہہ میں آرام کرتے کائی زدہ پتھروں پر رقم عبارتیں پڑھتا ہوں--- نہیں عبارتیں نہیں--- سب پر میرا نام ہے--- شکستہ حرفوں میں-- میں مزید جھکتا ہوں

اور اُس کے پانیوں میں گرتا ہوں، اُن میں اُتر جاتا ہوں اور وہاں ایک عجیب دنیا ہے--- ایک عجیب مہک ہے--- جھیل میں پانی کی سیڑھیاں ہیں جو میرے بوجھ سے کھلتی چلی جاتی ہیں اور میں کوشش میں ہوں کہ اُن کی تہہ کو چھو لوں--- یہ سیڑھیاں قدموں سے ناآشنا ہیں اور ہر سیڑھی پر میرا نام لکھا ہے اور میں تہہ سے ٹکرا جاتا ہوں--- میرا بدن پھل جاتا ہے اور مجھے سانس نہیں آ رہا اور اس خواب مسلسل کا کوئی انجام نہیں---

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کا بتانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

ہاں--- آئینے میں پھول کھلا ہے اور میں اُسے ہاتھ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں--- پھول کی رنگت زرد ہے اور وہ مجھ سے دُور ہوتا جاتا ہے--- جھیل کے پانی سمندر ہیں--- کتنے سمندر--- اور بول میری مچھلی کتنا پانی--- اتنا پانی--- میں پھر ہاتھ بڑھاتا ہوں--- کوئی میرا ہاتھ تھام لیتا ہے--- میں آنکھیں وا کرتا ہوں--- ٹیرس پر کھلنے والے دروازے میں سے تیز دھوپ اندر آ رہی ہے اور میاں فرزند علی اپنی دبیز عینک کے عقب میں خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھور رہے ہیں اور ظاہر ہے انہوں نے ہی میرا ہاتھ تھام رکھا ہے---

"میاں صاحب---" میں ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں "آپ نے میرا ہاتھ کیوں تھاما ہوا ہے؟"

"تو کر لو گل---" انہوں نے خالی کمرے سے داد وصول کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا "ایک تو آنکھیں بند کئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے سلاما لیکم کہہ رہے تھے۔ اب میں نے وعلیکم السلام کہہ کر دست پنجہ لیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہاتھ کیوں تھام رکھا ہے۔"

"سوری میاں صاحب---" میں نے معذرت کی حالانکہ معذرت انہیں کرنی چاہئے تھی کہ پھول کی بجائے وہ سامنے آ گئے تھے۔

میاں صاحب قطعی طور پر خوشگوار موڈ میں نہیں تھے "اچھے لیڈر بنے پھرتے ہو۔ ساری ٹیم تیار ہو کر ناشتے کو پھینٹ دے کر ریڈی ہو چکی ہے اور آپ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہو"

میں نے اپنے آپ کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی لیکن بدن میں پچھلی شب کی بے خوابی کی کرونیں تھیں "میاں صاحب میں سو رہا تھا کیونکہ قوم جاگ رہی تھی"

"قوم باغی ہو جائے گی جنابِ عالی---" اُن کی ناراضگی کی سلوٹیں اُن کے ماتھے پر

نمایاں تھیں "اب ذرا شتابی سے اُٹھ بیٹھو"

"میاں صاحب---" میں نے کمبل پرے کرتے ہوئے عرض کیا "کسی نے کہا تھا--- آنکھیں کھلتے ہی بستر سے اس طرح نہ اُٹھ بھاگو جیسے کسی چیز نے تمہیں ڈنک مار لیا ہو--- سب سے پہلے اس خواب کے بارے میں سوچو جو تم نے دیکھا ہے--- تو میں ابھی اُس خواب کے بارے میں---"

"یہ کس نامانیم نے کہا تھا؟"

"رسول حمزہ توف نے---"

"اِس حمزہ توپ کو دنیا کا اور کوئی کام نہ ہو گا اس لئے بستر میں پڑا خواب دیکھتا رہتا ہو گا---"

"حمزہ توپ نہیں میاں صاحب--- حمزہ توف---"

"تارڑ صاحب آپ مجھے جعلی دانشوری کی مار نہ ماریں--- جنابِ عالی میں ایسا جبر جنگ وکیل ہوں کہ میں جب بحث کرتا ہوں تو ہائی کورٹ کے کنگرے کانپتے ہیں--- نہیں سمجھے؟"

"سمجھ گیا---"

"تو پھر ذرا شتابی سے اٹھیں اور باہر آ کر اپنی ٹیم کو سمجھائیں---"

"میں سمجھاتا ہوں لیکن کس کو کیا سمجھاؤں؟"

"ذرا باہر آ کر دیکھیں کہ شاہد عزیز ایک مرتبہ پھر میرے سمجھانے کے باوجود ایک چڑ مڑ پلپلی صاحبوں والا ہیٹ اور شاہ عالمی کے فٹ پاتھ سے خریدی ہوئی پندرہ روپے والی پلاسٹک کی کالی عینک پہن کر جاسوس ہو گیا ہے"

چنانچہ میں شتابی سے اُٹھا اور تیار ہو کر کمرے سے باہر آ گیا اور باہر واقعی شاہد عزیز ایک چڑ مڑ ہیٹ اور سیاہ عینک میں جاسوس بنا کھڑا تھا۔

"اب یہ بتائیں کہ اِس نے جو گیٹ اپ کر رکھا ہے یہ ٹریکرز والا ہے؟" میاں صاحب نے اپنے عزیز از جان دوست شاہد عزیز کی طرف عینک سمیت دیکھا۔

"میاں صاحب---" شاہد عزیز کا وصف یہ ہے کہ وہ طلعت حسین کی طرح گفتگو میں اتنے لمبے وقفے دیتا ہے کہ اس دوران آپ بازار سے سبزی لا سکتے ہیں اور وہ ابھی "میاں صاحب---" پر ہی اٹکا ہو گا۔ "میاں صاحب---" اس نے کہا "آپ کی طرف پھونک ماریں تو آپ لاہور سے کالا شاہ کاکو پہنچ جاتے ہیں اور وہاں بھی اگر کوئی بچہ ڈھانگا لے کر کھڑا ہو تو آپ کو لوٹ سکتا ہے--- اب اس مرنجان مرنج بدن اور اتنی موٹی عینک

کے ساتھ --- یہ ٹریکرز والا گیٹ اپ ہے؟"

میاں صاحب نے فوراً ہتھیار ڈال دیے "یار تو میرا یار نہیں ہے؟"

"ہوں---" شاہد نے ہیٹ اٹھا کر اپنے جا بے جا بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے نتیجے میں اس نے چند بال تلاش کر لئے "لیکن آپ نے آئندہ میرے ہیٹ اور سیاہ عینک پر اعتراض نہیں کرنا"

"میاں صاحب--- لیڈر کی حیثیت سے--- میں اور کیا کروں؟"

"اس نئے لڑکے کو سمجھائیں جس نے سویرے سویرے--- بشام میں جہاں کوہستانی بہت ہیں--- ایک نیکر پہن لی ہے جس پر میڈونا کی تصویر بنی ہوئی ہے۔"

"آپ کو کیا اعتراض ہے؟" نوید نے ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ جوانی کے گھمنڈ میں اور جائز گھمنڈ میں کہا۔

"مجھے تو نہیں--- اعتراض تو میڈونا کو ہو گا جس کی تصویر بڑی غلط جگہ پر بنی ہوئی ہے" میاں صاحب نے ایک نرم مسکراہٹ عطا فرمائی "بھائی خوبصورت لڑکا اگر سویرے سویرے نیکر پہن لے تو پرابلم ہو سکتی ہے--- اور ہاں لیڈر صاحب--- وہ خالد ندیم بھی صبح سویرے مونڈھے پر تولیہ ڈال کر نیچے دریا پر نہانے چلا گیا ہے اُسے بھی سمجھائیں---"

"دیکھیں میاں صاحب---" میں نے ذرا لیڈرانہ رُعب سے کہا "آپ ذرا اپنے بھائی گیٹ سے باہر آجائیں۔ ہر شخص جو کندھے پر تولیہ ڈال کر گھومتا ہے ضروری نہیں کہ--- ہاں--- تو ہم سب ایک ٹیم ہیں۔ دوستوں کی--- ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ جو جی چاہے کرے"

"بے شک---" میاں صاحب نے پھر نوید کی طرف دیکھا "پر نیکر پہن کر امتحان تو نہ لے---"

"امتحان تو میرا ہو رہا ہے سر---" ملتانی خالد نے انتہائی بے بسی سے کہا "میرا بھی ایک خاص شعبہ ہے"

"یہ تو ذرا بعد میں پتہ چلے گا کہ کس کا کونسا شعبہ ہے---" نوید نے ایسے انداز میں کہا کہ خالد سہم گیا۔

"اور ہاں---" میاں صاحب فوراً بولے "وہ چڑیا گھر والے آپ کو یاد کر رہے تھے"

"اچھا---" بقا نے یکدم ایک قہقہہ لگایا "اس بڈھے شیر کو کس چڑیا گھر نے یاد کر لیا ہے"

"آپ خاموش رہیں---" میں نے محسوس کیا کہ ٹیم اپنے لیڈر کے بارے میں بد تمیز ہو رہی ہے "جی تو میاں صاحب---"

"بس وہ چڑیا گھر والے صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے"

"کونسے چڑیا گھر والے؟"

"وہی مینجر صاحب موٹل کے--- جن کا نام پتہ نہیں بہت سے شیر ہیں"

"اچھا شیر ستان---"

شیر ستان موٹل کے برآمدے میں اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھے ہماری گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا--- اس لئے کہ اس کے سامنے اس قبیلے کے افراد کھڑے تھے جنہیں وہ جانتا تھا--- جن سے روز اُس کا واسطہ پڑتا تھا--- وہ میدانوں کی جانب سے آتے تھے اپنی نارمل زندگیوں کے تناؤ اور جبلتوں کے ساتھ اور یہاں بشام میں اُن کی پہلی ماہیئت مزاج ہوتی تھی اور وہ آوارہ مزاجوں میں تبدیل ہو جاتے تھے چنانچہ جس قسم کے مکالمے ہمارے درمیان چل رہے تھے وہ اُن سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب پندرہ بیس روز بعد یہی لوگ اپنی آرزوؤں کی بلندیوں اور خواہشوں کی جھیلوں کو چھو کر واپس آئیں گے تو بدلے ہوئے ہوں گے--- اُن کی داڑھیاں بڑھی ہوئی ہوں گی۔ جلد اتر رہی ہو گی اور اُن کی آنکھوں میں ایک وحشت کی ایک خاص سُرخی ہو گی۔ وہ دنیا جہان سے لاپرواہ ہو چکے ہوں گے اور بشام سے دوبارہ اپنی دنیا میں واپس جاتے ہوئے جھجکیں گے--- اپنی دنیا سے اجتناب کریں گے--- وہ جانتا تھا۔

ڈرائیور بادشاہ خان جسے ہم بادشاہ سلامت کہتے تھے ہمارے رُک سیک اور سامان ویگن کی چھت پر لوڈ کر کے اُس پر ترپال باندھ چکا تھا اور اب ایک مخدوش قسم کا سگرٹ پھونکتا ہوا میری طرف دیکھتا تھا کہ--- کب چلنا ہے؟

"چلیں میاں صاحب---"

"ایک اور بات لیڈر صاحب--- نیکر کی بات تو ہو گئی۔ نوید کو یہ بھی سمجھائیں کہ اس نے اپنی پی کیپ اُلٹی پہن رکھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اس کی گچی مروڑ دی ہے"

"ان دنوں فیشن ہے میاں صاحب---"

"ہر اُلٹی شے فیشن ہو گئی ہے---" میاں صاحب نے ہاتھ جھٹک کر کہا--- اس پر بقا نے یکدم ایک ضرورت سے زیادہ بلند قہقہہ لگایا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے؟" میاں صاحب ناگواری سے بولے۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں--- شکایت ہے--- ہر شخص کہتا تھا کہ بشام میں سندھ کی گونج سے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا---"

"اس لئے جانِ من کہ تمہارا ایک اینٹینا کام نہیں کرتا" خالد نے اسے تھپکی دی "دوسرا اینٹینا سندھ کی طرح گھماؤ تو کچھ سنائی دے"

بقاء نے بڑی سنجیدگی سے اپنا دوسرا کان دریا کی جانب کیا اور پھر ایک اور زور دار قہقہہ لگایا "آہو یار بڑی گونج ہے' کم از کم میرا ایک کان تو بہرا ہو رہا ہے"

خالد ندیم حسب عادت ایک کاؤ بوائے ہیٹ میں کندھے پر تولیہ ڈالے خوش خوش واپس آ رہا تھا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"میں ذرا اشنان کر رہا تھا سَر---"

"اور اگر ہم تمہیں چھوڑ کر چلے جاتے تو؟"

"مجھے پتہ تھا آپ میرے بغیر نہیں جا سکتے--- "وہ ہنسا" ابھی تک اس سینے پر وہ زخم تازہ ہے جب آپ لوگ مجھے اسکولے میں چھوڑ کر کے۔ٹو کی طرف چلے گئے تھے۔ ابھی تک زخم تازہ ہے "اس نے ہنستے ہوئے اپنے سینے پر ایک دو ہتڑ رسید کیا" خالو اس بار تو مجھے چھوڑ کر نہ جانا--- ڈاکٹر عمر بڑا دل پذیر بندہ ہے لیکن میں اُسے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔۔ اس نے مجھے اسکولے سے واپس بھیجا تھا صرف اس لئے کہ میں بنیان پہن کر ساری رات سردی میں چہل قدمی کرتا رہا تھا۔۔ صرف اس جرم میں مجھے واپس بھیج دیا گیا۔۔"

"کاش ڈاکٹر عمر یہاں بھی ہمارے ساتھ ہوتے--- "شاہد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری" اور اس خالد ندیم کو سویرے سویرے اباسین میں نہانے کے جرم میں واپس بھیج دیتے"

اور یہی وہ لمحہ تھا جب ہم سب نے ڈاکٹر عمر خان کو بہت یاد کیا---

ڈاکٹر عمر کے۔ٹو مہم میں ہمارا ساتھی اور بیلی تھا--- اُس کے ساتھ ہم سب کی دوستیاں تھیں--- وہ ایک شرماتا ہوا خوش شکل محبوب پٹھان تھا--- وہ بالتورو کی دراڑوں سے--- برالڈو کے مرگ راستوں سے' مشابرم کے پہلو میں برفانی عجائب گھر کی موت ندیوں سے اور کنکورڈیا کی منجمد راتوں سے بچ کر واپس آ گیا تھا لیکن لاہور کے ایک چوک میں جب وہ اپنی طاقتور موٹر سائیکل کو نیوٹرل گیئر میں ڈالے ساکت حالت میں ٹریفک سگنل کے سبز ہونے کا انتظار کر رہا تھا ایک ویگن کی زد میں آ گیا تھا--- وہ یوں روندا گیا تھا کہ اُس کی کوئی ہڈی سلامت نہ رہی اور بدن کا کوئی حصہ نہ رہا جو زخمایا نہ گیا اور جس میں

سے خون کی ندیاں نہ بہی ہوں-- اگر جنرل ہسپتال میں اُس کا ایک ڈاکٹر دوست اسے فوری طور پر پہچان نہ لیتا اور فوری طبی امداد مہیا نہ کرتا تو وہ--- دو برس کے مسلسل آپریشن اور اُس کی قوتِ ارادی اُسے زندگی میں واپس لے آئی لیکن اُسے ایک ٹانگ میں لارڈ بائرن کا جھکاؤ دے گئی--- اب اُس کی ایک ٹانگ میں لوہے کی ایک سلاخ ہے جو اُس کی قوتِ ارادی سے زیادہ مضبوط نہیں--- میں نے جب اُسے جھیل کرومبر کی مہم کے بارے میں بتایا تو شاید اُس کی آنکھوں میں ایک نمی آئی "تارڑ صاحب--- میری ایک ٹانگ میں جھکاؤ نہیں آ سکتا۔ ابھی نہیں--- انشاء اللہ اگلے برس"

اور یہ وہی لمحہ تھا بشام سے روانگی کے وقت جب ہم نے ڈاکٹر عمر کو بہت مس کیا۔

قراقرم

"عاشق روڈ--- شاہراہ قراقرم سے الگ ہو کر"

"یہ عاشق روڈ ہے" بشام سے نکلتے ہی شانگلا پاس کو اٹھتی ہوئی تنگ درّہ نما سڑک کے ذرا آگے، سندھ جہاں گہرائی میں پارے کی ایک ندی کی طرح چمکتا تھا وہاں بادشاہ خان نے ایک شاہانہ اشارہ کیا "یہ عاشق روڈ ہے"

ایک کوہستانی روڈ، شاہراہ قراقرم سے الگ ہو کر اوپر اٹھتی تھی--- کہاں جاتی تھی، یہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"واقعی؟ کسی روڈ کا نام عاشق روڈ تو نہیں ہو سکتا"

"کون نامانیم ہے جو یہاں ایسے جبر جنگ اور خوفناک علاقے میں عشق کرے، ہیں جی؟" میاں صاحب نے اعتراض کیا۔

ایک کوہستانی روڈ--- شاہراہ قراقرم سے الگ ہو کر---

کہیں بلند پہاڑوں میں---

کون ہے جو تنہا ہے اور کوئی بھی اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہے---

کون ہے؟

ایک نوجوان میجر نے کہا "میں ہوں---"

"میں تمہیں نہیں جانتا--- تم کہاں ہو--- اور کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں ہوں---" ایک زرد رُو لڑکی نے کہا۔

یہ کیسی آوازیں ہیں--- بشام سے نکلتے ہی، شانگلا پاس کو اٹھتی تنگ سڑک سے ذرا ادھر یہ کیسی آوازیں ہیں--- عشق کے مارے اگرچہ جنگل میں ایک ڈھور کی طرح پھرتے ہیں لیکن اُن کا عشق تو کہیں اور ہوتا ہے۔ ایسے ویران کوہستانوں اور بیابانوں میں تو نہیں ہوتا--- عشق کے لئے تو--- سسی کے صحرا اور سوہنی کے چناب درکار ہیں۔ شہر بھنبھور اور کچے گھڑے درکار ہیں--- ہیر کا جنگل بیلے میں رانگلا پلنگ درکار ہے جس کی ادوائن کے

زور سے اُس کے دودھیا بدن پر نیل پڑتے ہیں--- لیکن یہاں--- یہاں عشق کیسے آگیا--

"میں بتاؤں صاحب---" بادشاہ خان نے پیشکش کی۔

"ہاں بتاؤ"

"صاحب، یہاں ایک میجر صاحب کا ڈیوٹی لگ گیا--- نیچے پنجاب سے آیا ہوا میجر صاحب--- اِدھر اوپر گشت کرتا تھا-- اور اوپر--- آپ دیکھو--- اوپر جہاں بہت بربادِ قسم کا جگہ ہے پتھروں میں اُدھر ایک چھوٹا قصبہ ہے--- دس بارہ چولہوں کا-- وہاں گشت کے دوران اُس پنجابی میجر نے ادھر کی--- ایک عام گنوار سی لڑکی کو چشمے پر پانی بھرتے دیکھ لیا--- جیسا فلم میں ہوتا ہے اور جانے کیوں خدا جانے کیوں صاحب ہماری سمجھ سے باہر ہے وہ محبت میں پھنس گیا صاحب--- وہ روزانہ پانی بھرنے کے ٹیم ادھر آتا تھا اور اُسے دیکھتا تھا--- دیکھتا تھا اور چلا جاتا تھا--- پھر اُس نے مردوں والا کام کیا۔ لڑکی کے باپ کو بولا "ہم اس کے ساتھ شادی بنائے گا---" اُس کا باپ بھی ادھر کا ان پڑھ لوگ تھا وہ کہنے لگا "کیسے بنائے گا آپ میجر صاحب ہو، بڑا افسر ہو، ہم ادھر کا کوہستانی لوگ ہے---" میجر نے بولا "نہیں بنائے گا" ادھر گاؤں والوں نے بولا کہ نہیں ہم یہ شادی نہیں بنانے دیں گے--- تو وہ میجر اپنے بڑے افسر کے پاس گیا کہ صاحب ہم اُس لڑکی کے ساتھ قانون اور مذہب کے مطابق بیوی بنائے گا۔ آپ مدد کرو--- اور جب افسر نے لڑکی کے باپ سے بات کیا تو وہ کہنے لگا "نہیں، گاؤں والا نہیں مانے گا" اور پھر بہت بات ہوا--- روزانہ بات ہوا تو گاؤں والا کے دماغ میں ایک تجویز آئی، وہ کہنے لگے "ادھر نیچے سے شاہراہ قراقرم سے ہمارے گاؤں تک کوئی سڑک نہیں--- ہم ادھر چڑھتے ہوئے گرتا ہے اور کئی مر جاتا ہے۔ گدھا اور خچر بھی نہیں آسکتا--- میجر کو بولو کہ اگر اس کا عشق سچا والا ہے تو اِدھر گاؤں تک روڈ بنا دے--- اور صاحب تین سال لگے--- اس میجر کو--- کسی کا مدد نہیں لیا--- خود دوستوں کے ساتھ مل کر--- اپنی پونجی لگا کر--- ادھار مانگ کر یہ سڑک بنا دیا اور گاؤں تک لڑکی کے گھر تک لے گیا---"

"واہ" بھتاّ بولا۔

"ویل ڈن---" شاہد نے کہا۔

"سبحان اللہ" یہ خالد ندیم تھا۔

"بڑا نامانیم عاشق تھا بھئی---" میاں صاحب بھی متاثر ہو چکے تھے "فرہاد نے نہر کھودی اور پتہ نہیں کھودی یا صرف قصّے ہیں لیکن اُس کی سڑک تو ہم نے دیکھ لی ہے-- شاباش بھئی"

"آگے سنو یارا---" بادشاہ خان کچھ رنجیدہ ہو کر بولا "سڑک بنا تو گاؤں والا کا عید ہو گیا انہوں نے خوش ہو کر لڑکی کے باپ کو بولا" تم بے شک بیٹی کا شادی میجر کے ساتھ بنا دو--- جس نے ہمارا گاؤں کو نیچے شاہراہ سے ملا دیا ہے "تو جناب اُن دونوں کا شادی بن گیا--- شادی کے ایک ہفتے بعد میجر اُس کو لاہور لے کر گیا اپنے گھر- ادھر چند روز ٹھہرا اور پھر وہ دونوں میاں بیوی ادھر سازین واپس آنے کے لئے چلا--- تو صاحب راستے میں ادھر لالہ موسےٰ کا شہر جو آتا ہے اس کے قریب اُن کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوا--- وہ دونوں مر گئے"

ویگن میں کسی نے کوئی سوال نہ پوچھا کہ کیسے مر گئے- کیونکر مر گئے- مرتے ہوئے اُن کے ہاتھ--- خون آلود ہاتھ--- ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھے کہ نہیں--- کسی نے کچھ نہیں پوچھا اور عاشق روڈ کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے---

اگر یہ عشق خاص نصیب والوں کے حصے میں آتا ہے تو حادثے کا خنجر کیوں سینے میں پیوست ہوتا ہے---

ہماری اگلی منزل داسو سے پرے برسین تھی---

بلند پہاڑوں میں کہیں---

شیر دریا سے اتنی بلندی پر کہ اس کی گونج راستے میں ہی رہ جاتی تھی اور وہاں صرف خاموشی اور تیز ہوا تھی- بلند پہاڑوں میں یہ موٹل خود ہی ایک کائنات تھا- اس کی اپنی دنیا تھی--- ہم نے دوپہر کا کھانا برسین کے موٹل میں کھایا--- ایک صحرا میں--- ویرانے میں--- صحرا میں اُگے پھولوں کے رنگ دھوپ میں آنکھوں میں چبھتے تھے---

برسین ایک ایسی بلندی پر ہے جہاں--- انسان اپنی ناآسودہ اور ناتمام خواہشوں میں مبتلا ہو جاتا ہے- جیسے--- بتراسی کے جنگل میں سائیں سائیں کرتے ریسٹ ہاؤس کے چپ دیار کی خوشبو والے کمرے کی نیم ٹھنڈک میں--- نتھیا گلی کے ایک کاٹیج میں--- قلعہ ڈیراور کے زیرِ زمین کچے کمروں میں--- یہاں برسین میں--- اس بلندی اور ویرانی میں جہاں سے سندھ ایک بے حقیقت ندی کی طرح دکھتا ہے--- نہ کوئی پہروں آتا ہے نہ جاتا ہے-- آپ اس بلندی کی قید میں ہیں- الگ اور کٹے ہوئے ہیں--- یہاں--- تنہائی کے اس طلسم میں--- کوئی ناتمام خواہش ہو-

اندر ڈائننگ روم میں اگر پردے کھینچ دیئے جائیں تو ہم کسی بھی شہر میں ہو سکتے تھے- وال ٹو وال کارپٹنگ- نفاست سے سجی میزیں اور ان پر ترتیب شدہ چھری کانٹے اور کراکری، ہم کہیں بھی ہو سکتے تھے- اور باہر بلندی کا جھکاؤ ہم پر تھا اور نیچے شاہراہ قراقرم

ویران پڑی تھی اور اُس سے کہیں نیچے سندھ کا چمکتا فیتہ--- اور یہاں تیز ہوا تھی-

برسین ہوٹل ایسی جگہیں آوارہ گردوں کے لئے انتہائی مضر ثابت ہو سکتی ہیں- ان کے آرام دہ بستر اور چمکتے باتھ روم انہیں سست کر دیتے ہیں اور گرم خوراک اُن کی جڑوں میں بیٹھ جاتی ہے اس لئے ہم نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے اپنی کمر کسی--- جاگرز کے ڈھیلے کئے ہوئے تسمے کسے اور برسین ہوٹل کی اُن آسائشوں سے منہ موڑا جو آوارہ گردوں کے ایمان کو متزلزل کرنے پر قادر تھیں-

وہی منزلیں--- وہی راستے---

دل میں خوف کی تہہ در تہہ بٹھانے والی شاہراہ قراقرم وہی تھی--- گیارہ برس پیشتر میں یہاں ایک خوفزدہ اجنبی تھا جو اپنے بیٹے سلجوق کے ہمراہ اس پر سفر کرتا تھا--- اب سفر کرتا تھا تو میری اس کی متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن میں خوفزدہ اب بھی تھا-

وہی منزلیں، وہی راستے---

وادیٔ تانگیل سے آنے والا نیلو نیل نالہ--- جو سندھ کے گدلے پانیوں میں شامل ہوتا تو دُور تک اپنی شفافی قائم رکھنے کی کوشش میں الگ نظر آتا اور پھر کسی نیک شخص کے ایک گمراہ معاشرے میں وجود کی طرح مجبوراً اُس کے رنگ میں رنگا جاتا۔

چلاس کی بے آب و گیاہ ویرانی اور وسعت میں سے ہم گزرتے گئے--- یہیں بدھ عہد کی چٹانیں تھیں جن کے بارے میں ڈاکٹر دانی نے ایک اہم دستاویز تحریر کی تھی- ایک شام میں بھی ادھر آیا تھا- سندھ کے ریتلے کناروں میں سے وہ چٹانیں ابھری ہوئی تھیں جن پر ہزاروں برس قدیم نقش کھدے ہوئے تھے- ان میں جانور اور شکاری تھے- مہاتما بدھ کے گیان کے لمحے تھے اور جو بدھ یاتری چین سے ٹیکسلا تک کا زیارتی سفر کرتے تھے اُن کے ہاتھوں کی لکیریں تھیں اور میں انہیں دیکھ کر بہت آزردہ ہوا تھا--- اس لئے کہ دو ہزار برس بعد یہاں سے جو لوگ گزریں گے انہیں شائبہ تک نہ ہو گا کہ ادھر سے ہم گزرے تھے---

بونر فارم کے قریب وہ نالہ آیا جو نانگا پربت کے دیامیر چہرے میں سے اتر کر آ رہا تھا--- اس کے کنارے پر وہ راستہ اٹھتا تھا جو تین روز کی مسافت کے بعد آپ کو اس سحرزدہ اور قاتل پہاڑ کے دامن تک لے جاتا تھا- یہیں کہیں اس بوڑھے چرواہے کا جھونپڑا تھا جو رائن ہولڈ میسنر کو نیم بیہوشی اور حواس باختگی کے عالم میں نانگا پربت کی برفوں میں سے اٹھا کر نیچے لے آیا تھا-

زندگی کے اَن گنت مسائل میں سے ایک مسئلہ بلکہ معاملہ دل کا بھی ہے--- ہر

شخص کا دل کہیں نہ کہیں رُکتا ہے۔ کسی کے لئے یہ بیماری دل آخر کام تمام کرتی ہے۔ کسی کا کام ہی بیماری دل سے شروع ہوتا ہے۔ میرا مسئلہ بھی دل کا ہے جو رُکتا بہت ہے--- قربتِ حُسن میں بھی، قربت موت میں بھی اور قربتِ سنگ میں بھی--- مجھے کبھی محبوب کی سنگ دلی کا شکوہ نہیں ہوا۔ موت ہر شخص کا مقدر ہے لیکن قُربتِ سنگ نے مجھے زندگی میں بہت خوار کیا ہے۔ اس کے طلسم نے ہمیشہ مجھے رُسوا کیا ہے چنانچہ چلاس سے نکلتے ہی جہاں شاہراہ ہموار میدان میں سے گذرتی ہے جب میں نے نانگا پربت کی سفیدی دیکھی تو میرا دل ضرور رُکا--- اور اتنی دیر کے لئے کہ طبی نکتہ نگاہ سے اس کا پھر سے چلنا ناممکن قرار پا جاتا---

رائے کوٹ پُل جوں جوں قریب آتا تھا میں اُس کے سفید حُسن کی دہشت میں مبتلا ہو کر--- جو کہ رائے کوٹ پُل سے اُوپر ایک ویران اور خشک گاؤں تاتو کے گرم چشموں سے پرے--- ایک جان لیوا چڑھائی کے بعد، فنتوری ایک فیئری کے بعد فیئری میڈو کی صُورت میں نظر کے سامنے آتا تھا--- میں اُس کے سفید حُسن میں مبتلا ہو کر بے بس ہو جاتا تھا--- بادشاہ خان کا ٹیپ ریکارڈر فل والیوم پر تھا--- ٹیم ممبرز کی گفتگوئیں اور جتاہ کے قہقہے فُل والیوم پر تھے لیکن میرے لئے کُل جہان کی آوازیں مدھم ہوتی جاتی تھیں کیونکہ رائے کوٹ پُل نزدیک آ رہا تھا--- اور وہاں سے فیئری میڈو کو راستہ جاتا تھا--- میں اُن زمانوں میں وہاں پہنچا تھا جب تاتو تک سڑک نہیں پہنچی تھی--- اور وہاں تک صرف قسمت والے یا خرِدماغ--- خر حضرات پر سامان لادے--- اپنی قسمت کو کوستے--- خشک چٹانوں میں سے سرکتے کرلوں سے بچتے--- تاتو پہنچتے تھے۔

اور اب وہاں تک ایک--- اگرچہ ایک بلندیوں پر معلّق اور لٹکتی ہوئی اور جب تک موت ہمیں جُدا نہیں کر دیتی قسم کی سڑک--- جاتی تو تھی۔

رائے کوٹ پُل بھی ہمیشہ مجھے اور میرے دل کو روکتا تھا--- ٹرین پر سفر کرتے ہوئے اُس سٹیشن کی طرح جس کے عقب میں وہ شہر ہے وہ بستی ہے جہاں دنیا کی سب سے مَن موہنی اور سوہنی لڑکی رہتی ہے اور آپ وہیں اُتر جانا چاہتے ہیں--- لیکن آپ کی منزل کوئی اور ہوتی ہے۔

ویگن آہستہ ہونے لگی۔

رائے کوٹ پُل کے شیر گیارہ برس قبل بھی اتنے ہی شیر تھے جتنے آج تھے۔ منہ کھولے ہوئے۔ سندھ کے پانیوں کے اوپر ایک شاہانہ نشست میں پتھر میں پتھرائے ہوئے۔

ویگن رُک گئی۔

شنگریلا کے پہلو میں وہ متروک راستہ مجھے دیکھتا تھا جس پر میں چلا تھا اور بولڈر برج کی کٹھنائیوں سے دوچار ہوا تھا اور ذرا اُدھر وہ سڑک تھی جس کے لئے دو جیپیں اُن کوہ نوردوں کے انتظار میں تھیں جنہیں وہ پون گھنٹے کے اندر اندر قدرے مہنگے کرائے کی وصولی پر تاتو تک پہنچا سکتی تھیں۔

"اُدھر آپ لوگ ریسٹ مارے گا---" بادشاہ خان نے ہینڈ بریک لگا کر ہمیں حکم دیا "اور ہم ذرا اُدھر جاتا ہے"

وہ اپنا ازار بند ڈھیلا کرتا اُدھر چلا گیا پُل سے نیچے، جہاں میں نے پہلی بار اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔

پربت

"بیس کیمپ نانگا پربت--- مشعلوں کی روشنی میں فیری میڈو کو واپسی"

"آپ ہر شے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی ہیں--- یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فیری میڈو اتنا خوبصورت ہو جتنا آپ بیان کرتے ہیں"--- بیگم اگرچہ ناگواری کے انداز میں کہتیں لیکن مجھے شک گذرتا کہ اس میں کہیں حُسن طلب پوشیدہ ہے۔

ایک ادیب ہونا ایک اداکار ہونا زندگی کے حساس لمحوں میں اکثر انتہائی مہلک ثابت ہوتا ہے--- آپ کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا کیونکہ لفظ اور اظہار آپ کا پیشہ ہیں--- مجھ پر بھی حُسن کو، محبت کو، دُکھ کو، سُکھ کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اپنے احساسات کو جذباتی سطح پر سامنے لانے پر اداکار ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے--- تو ایک ادیب اور ایک اداکار زندگی کے کسی ایک لمحے میں یہ کیسے ثابت کرے کہ وہ مخلص ہے اُس کے لفظ سچے ہیں اس کی آنکھوں میں جو نمی ہے اُس میں اُس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا ہرگز عمل دخل نہیں--- میں بے شک ذہنی آزردگی اور شکستگی کے اس عالم میں ہوں جب میں سوفیصد سنجیدگی سے زہر کی ایک پڑیا پھانک کر اپنے آپ کو قبر کی زینت بنانے پر تُلا ہوں تو بھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ یہی الزام دوہرایا جائے گا کہ تم ایک اچھے اداکار ہو--- بھول جاؤ کہ ہم تمہاری اس دھمکی کو سنجیدگی سے لیتے ہیں--- ایسی صورتِ حال میں ایک شخص کیا کر سکتا ہے؟ یہی کر سکتا ہے ناں کہ فی الفور خودکشی کا ارادہ ترک کر دے اور پھانکے گئے زہر کا تریاق تلاش کرے--- کہ کیا فائدہ ایسے فوت ہو جانے سے کہ کوئی آپ کی موت کو سنجیدگی سے نہ لے--- چنانچہ ہماری بیگم نے کبھی ہمارے احساسات کو سنجیدگی سے نہیں لیا--- میں نے سوچا زندگی میں ایک مرتبہ تو یہ ثابت کر دوں کہ جو کچھ میں بیان کرتا ہوں وہ سراسر سچ ہے اور کس طرح ثابت کروں--- بیگم کو فیری میڈو لے جا کر--- لیکن--- فیری میڈو تک ایک خودماغ تنہا تو جا سکتا ہے۔ اُس خودماغ کے بال بچے کیسے جا سکتے ہیں؟

وہ ایسے جا سکتے ہیں کہ ایک شام اسلام آباد میں آپ اپنے ایک عزیز دوست عارف اسلم اور اُن کی ہسپانوی بیگم کے ساتھ بیویوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور عارف کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب آپ اپنے بال بچوں کو فیری میڈو لے کر کیوں نہیں جاتے--- اور میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں کہ کیسے؟--- اور وہ کہتے ہیں کہ--- ایسے--- اور ایسے کیسے؟

اور ایسے ایسے کہ عارف--- شمال کی داستانوی شخصیت--- اکثر اوقات پسندیدہ، بعض اوقات متنازعہ--- بریگیڈیئر اسلم کے بیٹے ہیں--- شنگریلا ہوٹلز کے مالک ہیں، فیری میڈو کا ایک حصہ اُن کی ملکیت میں ہے اور وہ چلاس کے شنگریلا کے منیجر نظمی صاحب کو فون پر ہدایات دیتے ہیں کہ تارڑ خاندان وارد ہو رہا ہے۔ آپ نے انہیں فیری میڈو پہنچانا ہے ٹھہرانا ہے اور خیال رکھنا ہے---

ہم اپنی سفید سوزوکی میں فی الفور چلاس پہنچتے ہیں جہاں نظمی صاحب ایک لکھنوی بانکے کی طرح اپنے شین قاف کو کوہستانیوں سے بچاتے کھڑے پاجامے اور کُرتے میں ہمیں خوش آمدید کہتے ہیں اور--- خیال رکھتے ہیں۔

رائے کوٹ پُل کے شنگریلا ہوٹل کے پہلو میں جو متعدد گیراج ہیں اُن میں سے ایک میں ہماری سوزوکی کو پابند کر دیا جاتا ہے---

اور ہم--- میمونہ، سلجوق، سمیر، قرۃ العین--- اور ہم--- جمعہ خان کی کھڑکھڑاتی--- اور یقین کیجئے اُس جیپ میں جو صرف ہماری دعاؤں کے زور سے مجتمع تھی--- سوار ہوتے ہیں۔

جمعہ خان ایک نوجوان اور ہمیں فاترالعقل دکھتا تتو کا باسی تھا جس کا بایاں گال اس طرح پھُولا ہوا تھا جیسے اُس میں ایک غبارہ پھنس چکا ہو--- یہ غبارہ تو نہیں کسی نشہ آور سفوف کا گولا تھا--- اس نے حتمی طور پر ہم سب کے باقاعدہ بیٹھ جانے کا انتظار نہیں کیا۔ ہینڈ بریک کو اٹھایا اور اللہ تیری یاری--- سمیر اور سلجوق پلیٹ فارم سے نکلتی ہوئی گاڑی کے مسافروں کی طرح ہراساں گرتے پڑتے اُس میں سوار ہوئے--

جمعہ خان کی ڈرائیونگ کا ایک اپنا شیڈیول تھا اور اس میں ہم شامل نہیں تھے--- قسمت جلدی بدل جاتی ہے لیکن اُس کا گیئر بہت دیر میں بدلتا--- بریک لگنے سے جیپ آہستہ نہیں ہوتی تھی اور تیز ہو جاتی تھی۔

تتو تک کا سفر ایک ہانٹ میئر تھا۔

سڑک کی حالت خراب نہیں تھی۔ خانہ خراب تھی۔

اول تو ہمارے نزدیک یہ سڑک ہی نہ تھی ایک ایسا ٹریک تھا جس پر بکریاں اور قدرے بیوقوف بکریاں اپنے قدم ازحد احتیاط سے جما کر چل سکتی تھیں لیکن اس بکری ٹریک پر اپنے دائیں ہاتھ کے ٹائر تقریباً ہوا میں معلق اور اس ہوا میں جس کے عین نیچے صرف ایک کلومیٹر نیچے تاتو کا گندھک نالہ شور مچاتا تھا اگرچہ اس کا شور ہم تک پہنچتا نہ تھا--- تو اپنے دائیں ہاتھ کے ٹائر ہوا میں معلق کئے جیسے ایک ڈوگی کھمبے کو دیکھ کر کرتا ہے--- جمعہ خان اپنی ترنگ میں سٹیئرنگ کو گھماتا چلا جاتا ہے---

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک جیپ صرف دو ٹائروں پر چل سکے--- چلئے میں مان لیتا ہوں کہ میں اسے ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہوں--- لیکن ہمیں محسوس تو یہی ہو رہا تھا--- البتہ یہ سوفیصد حقیقت ہے کہ اگر جیپ ذرا لڑکھڑاتی ہے تو--- اللہ تیری یاری۔

میں جیپ کے راڈ کو گرفت میں لئے اپنے بچوں کے بے فکرے چہرے دیکھتے ہوئے ان کی عافیت کے لئے فکرمند کھائی سے پار بلند ہوتی چٹانی بولڈر ٹریک کی اس ویرانی اور خوفناکی کو دیکھ رہا ہوں جس کے بارے میں نانگا پربت کو سر کرنے والے جرمن کوہ پیما ہرمن بوہل نے کہا تھا کہ یہ دنیا کے ہولناک ٹریکس میں سے ایک ہے، اور اس ٹریک پر کئی برس پیشتر میں اور مطیع الرحمن اور گدھے اور قدم خان اور میں مسلمان تم مسلمان مولوی رحمن چلے تھے--- جمعہ خان کی اس جھولتی موت جس کا نام جیپ رکھ دیا گیا تھا کی نسبت میرا خیال ہے کہ وہ بولڈر برج نسبتاً محفوظ تھی۔

جیپ رکی تو بہ دیر ہماری گردش خون اور حرکت قلب بحال نہ ہوئی--- تاتو گاؤں سے آگے--- ایک پُرہشت نالے کے کنارے جمعہ خان اپنی پھولی ہوئی گال سمیت ہمیں فاتحانہ انداز میں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا--- اور اس کی مسکراہٹ یا اس کا فاترالعقل چہرہ یقیناً ایسا نہ تھا جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا ہم کرتے---

ہمارا سامان متعدد مزدور حضرات پر لاد دیا گیا۔

نالہ پار کرتے ہی فنتوری تک پہنچنے کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ چڑھائی نہ تھی سفاکی تھی--- ایک امتحان تھا کہ جو سرخرو ہو جائے وہ اوپر پہنچ کر--- سفید ٹھنڈک کے اس تاج محل کی زیارت کرلے جو فیئری میڈو ہے۔

ناقابل فہم طور پر عمیر سرہلاتا کسی مغربی پاپ سانگ کی دھن پر سرہلاتا اطمینان اور ٹھنڈک سے سب سے آگے جا رہا تھا جیسے چڑھائی نہ ہو ایک میدان ہو--- اس کے عقب میں سلجوق تھا اور اس کی پونی ٹیل تھی۔ ان دنوں اس کے بال کندھوں تک آتے تھے اور میمونہ کہتی "بیٹا تمہیں دیکھ کر اکثر شک ہوتا ہے کہ میری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں--- تم

کہو تو کنگھی کر کے پراندہ باندھ دوں؟"--- اور سلجوق اپنی عینک درست کرتا اپنی ماں کی ثقافتی پسماندگی پر مایوسی سے سرہلا کر مسکرا دیتا تھا۔ عینی نے ابھی سے آنکھوں پر ایک سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا تاکہ برف کی چمک ان پر اثرانداز نہ ہو اور وہ بھی اعتماد سے قدم بڑھا رہی تھی--- ان کے پیچھے میمونہ جھکی ہوئی--- اور شاید زندگی میں پہلی بار جھکی ہوئی کہ اس کا راجپوت خون کبھی یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ وہ جھکے--- تو وہ جھکی ہوئی آہستہ آہستہ پورٹرز کے مدد کے لئے بڑھے ہاتھوں کو نخوت سے پرے کرتی اوپر جا رہی تھی--- اور میں' ایک فرمانبردار خاوند اور باپ کی طرح اپنے خاندان کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور--- منہ کھولے' ہانپتا ہوا تھکتا چل رہا تھا۔

اور جب ہم نڈھال اور تھکے ہوئے آخری بلندی طے کر کے ایک چوبی دروازے کی چوکھٹ پار کر کے فنتوری کی فیصی میں پہنچتے ہیں تو سب چپ ہو جاتے ہیں--- فلاسک کھول کر پانی کا ایک ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں اور پھر بھی کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

"یہ کیا ہے؟" بالآخر میمونہ پوچھتی ہے۔

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں تھی۔"

"آپ نے اس منظر کو قطعی طور پر بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا---" وہ فنتوری کے سیا گلابوں اور سرد چشموں کے شور اور ان کے پس منظر میں ابھرتی سفید کائنات جو کہ نانگا پربت ہے اپنے اوپر اُمڈتے بے یقینی کے عالم میں تکتی ہوئی کہتی ہے "نہیں--- آپ اتنے بڑے ادیب نہیں کہ اس--- اس حیرت بے حساب اور بے یقین کو بیان کرسکیں"

"میں کیا کروں۔ کس کو کھا جاؤں لاؤ---" عمیر بولتا ہے "یہ تو لگتا ہے یہاں نہیں ہے"

"نہیں ہے یار---" سلجوق اپنی پونی ٹیل کو سہلاتا عینک کا زاویہ درست کرتا ہے "یہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے"

"ٹوٹلی میٹ---" عینی کہتی ہے۔

اور میں مطمئن اور شانت کہ مجھ پر عائد کردہ الزامات اس سفید پہاڑ نے باطل ثابت کر دیئے تھے۔

جب ہم فیئری میڈو میں--- اس پھاٹک میں سے اندر داخل ہوئے جو دراصل مویشیوں کو بھٹکنے سے روکنے کے لئے ایستادہ کیا گیا ہے--- تو بارش شروع ہو گئی۔ یکدم--- پلک جھپکتے ہی ایک سیاہ رات کا شائبہ ہوا جس میں بادلوں کے پرے جنگل میں

اُترتے تھے اور گہری دُھند اس ندی کو او جھل کرتی تھی جس میں نانگا پربت کا عکس تصویر ہوتا ہے--- سیاہ رات کے شانے میں برفیلی پھوار ہمارے بدنوں کے اندر تک جا رہی تھی۔

فیئری میڈو بارش کی نیم تاریکی میں--- دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں تھا---

گھاس کے اس سرسبز اور سیاہ دکھتے میدان کے پار گھنے جنگل میں سے دُھند سے الگ--- دھواں سا اُٹھتا تھا۔

یہ دھواں کہاں سے اُٹھتا ہے---

ہم تھکن سے چُور، ہارے ہوئے جواری کی پژمردگی سے فیئری میڈو کی تاریک گھاس اور پھولوں کو روندتے، بھیگتے اس کے پار جنگل میں داخل ہوئے تو انکشاف ہوا کہ دھواں کہاں سے اُٹھتا ہے---

نانگا پربت کی برفوں کے سائے میں، جنگل کے گھنے اور قدیم سحر کے اندر--- سٹرابیری کے پھولوں کی قربت میں ایک بستی آباد ہے--- ایک ہمارے بیڈروم کے سائز کا وسیع خیمہ--- کچن ٹینٹ--- سرونٹ کوارٹر قسم کا ایک اور خیمہ--- اور آس پاس مؤدب خدام حرکت کرتے ہوئے--- ان میں سے ایک--- جھکا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے "سَر کریم کافی اور فرنچ فرائز تیار ہیں--- رات کے کھانے کے لئے آپ کس قسم کا ڈنر پسند کریں گے--- پاکستانی؟ کانٹیننٹل یا چائنیز---"

ہمارے منہ کھل جاتے ہیں۔

عارف اسلم کے بندوبست واقعی مکمل تھے---

اس ناقابلِ فہم اور بے یقین منظر میں اس نے ہمارے لئے فائیو سٹار ہوٹلوں کی سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں--- ان آسائشوں میں ایک بڑا نیلا خیمہ جس میں فوم کے گدے تھے اور نفیس کمبل تھے اور لالٹینیں روشن تھیں--- ایک تجربہ کار باورچی جو ہر قسم کے کھانے تیار کرنے کا ماہر تھا--- اور شنگریلا کی ستھری کراکری۔

اس باکمال بندوبست میں صرف ایک ہی قباحت تھی کہ اس کے تلے فیئری میڈو کے جنگل میں کھلے سٹرابیری کے پھول بہت تھے اور وہ مسلے جاتے تھے۔

وہ دن عجیب دن تھے---

ہم ایک خاندان ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے خانوں اور خیالوں میں بٹ گئے۔

شاید میمونہ کو وہ تمام تر محرومیاں یاد آئیں جو مجھ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کے نصیب میں آئیں---

سمیر--- گھاس کے ایک تنکے اور اس پر اُڑتے ایک باریک پتنگے کی جزیات میں کھو جانے والا تخلیقی بچہ---

سلجوق--- اپنی الگ کائنات میں--- ایک گمشدہ رُوح--- جس کے بچپن کا بھولپن اور حیرت گم نہیں ہو سکتے تھے---

عینی--- ان سب سے اپنی بات منوانے کی ایکسپرٹ--- اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے سے آؤٹ ہونے کے باوجود ناٹ آؤٹ کا فیصلہ کروا لینے پر قادر---

اور میں--- اپنے برسوں--- اور بزدلیوں میں--- ایک ناکام اداکار کی طرح یاسیت اور پژمردگی میں--- ہم سب الگ الگ فیئری میڈو کے جنگل میں--- جو اس زمانے میں ایک کنوارا اور قدیم جنگل تھا--- ماضی کی شبیہیں اور شکلیں تلاش کرتے---

اس جنگل میں ایک ایسا درخت تھا جس کی چھال بھوج پتر کہلاتی ہے--- ایک زمانے میں--- جب بدھ بھکشو چلاس کے نزدیک پتھروں پر نقش کھودتے تھے یہ بھوج پتر اظہار کی واحد علامت تھا--- اس کے پرت کھلتے جاتے تھے۔ ان پرتوں پر--- وہ سب کچھ رقم تھا جو ہماری خواہشیں اور محرومیاں تھیں---

سمیر اس درخت پر چڑھ کر نہایت نازکی سے اس کی چھال کے پرت کھولتا جاتا--- اور انہیں اتنے غور سے دیکھتا جیسے ان پر کچھ عبارتیں رقم ہوں---

اس جنگل میں ایسے سوکھے ہوئے درخت اور لکڑی کے ڈھانچے تھے جو اپنی ذات میں مکمل مجسمے تھے--- ان کے سامنے کھڑے ہو کر جو کچھ آپ کو زندگی نے نہیں دیا تھا وہ سب کچھ مجسم نظر آتا تھا--- ان سوکھے ہوئے ٹنڈمنڈ درختوں کے تنوں اور شاخوں میں سارے جواب تھے--- زندگی نے جو کچھ آپ کو دیا وہ بھی--- وہ چہرے وہ علامتیں--- اور وہ بھی جو آپ سے پوشیدہ ہوا--- وہ ان کی شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔

اس فیئری میڈو سے پرے جنگل کے ایک ان دیکھے حصے میں ایک اور پوشیدہ فیئری میڈو اوجھل تھا۔ وہاں ایک ایسا سبزہ زار تھا جس میں دلدل تھی اور چشمے تھے اور نانگا پربت اجتناب اور حیا کے بغیر بے لباس نظر آتی تھی--- صرف اس لئے کہ یہاں اس کے سفید بدن کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا--- لیکن یہاں مکمل تنہائی کا ایک ان جانا ڈر بھی مقیم تھا---

اور کبھی صاف نیلے آسمان کسی سویر میں نکھری تیز دھوپ میں ڈھلے درختوں کی

چوٹیوں میں سے نیچے آتے محسوس ہوتے--- کڑی دھوپ میں نانگا پربت کو دیکھنا عذاب ہو جاتا--- اُس کی چمک اندھا کر دینے کے لئے کافی ہوتی---

اور کبھی ہر جانب دُھند کا راج ہو جاتا--- وہ اُترتی ایک گہری اداسی کی طرح اور فیری میڈو میں چرنے والی بھیڑیں خیالی اور غیر حقیقی لگتیں--- ہمارے کچن ٹینٹ کے باہر اٹھنے والا دھواں بھی دکھائی نہ دیتا--- ہر فرد الگ اور تنہا ہو جاتا--- دُھند ہمارے درمیان اُبلتی ہوئی ہمیں الگ کر دیتی تھی۔ نانگا پربت اور رائے کوٹ گلیشیر بھی گم ہو جاتے--- صرف جھکنے سے سٹرابیری کے سفید پھول دکھائی دے جاتے--- اور میمونہ بھی راجپوت ہونے کے باوجود اُن کے لئے جھک جاتی---

یہ ایسے ناقابلِ بیان زمانوں کا قصہ ہے جب فیری میڈو میں ہمارے سوا اور کوئی سیاح نہ تھا--- اور روئے زمین پر ہم جیسا کوئی بادشاہ نہ تھا جس کی اقلیم میں ایسے قدیم جنگل ہوں۔ قدموں میں سٹرابیری کے پھول--- چیڑ، بھوج پتر اور برچ کے درخت۔ چشمے اور ندیاں اور نانگا پربت جس کی خدمت پر مامور برف کے سانپ اور مینڈک ہوں--- اور ایسی دُھند اور ٹھنڈک ہو--- فیری میڈو میں ہمار سکہ--- بے شک نظام سقے کا سکہ--- چلتا تھا۔

اُوپر، فیری میڈو کے دائیں جانب ذرا بلند سطح پر جہاں چرواہوں کے گرمائی بسیرے تھے--- وہاں سے جب اذان کی صدا بلند ہوتی تو سلجوق اور سمیر--- اپنی جینوں اور پونی ٹیلوں سمیت نماز ادا کرنے کے لئے ایک خاص رغبت اور عشق کے ساتھ وہاں چلے جاتے--- پہلی بار جب وہ پتھروں سے بنی ہوئی مسجد کے اندر گئے تو چرواہوں کی عورتوں نے اُن کی وضع قطع دیکھ کر "کافر۔ کافر" کا شور مچا دیا تھا---

وہ دن عجیب دن تھے۔

شام ہوتی تو مقامی لوگ اور گڈریے ہمارے روشن کردہ الاؤ کے آس پاس آبیٹھتے--- ہمیں دیکھنا--- رات کے کھانے کی تیاری دیکھنا اُن کے لئے ایک آؤٹنگ تھی، تفریح تھی---

ایک گڈریا--- مفلوک الحال--- اور خستہ صحت کا جھکا ہوا--- اپنے سینے پر ہاتھ رکھے چلا آ رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور جھکا--- اُس کے سینے پر ایک کتاب تھی۔

"یہ کیا ہے؟" مونا نے اشارے سے دریافت کیا۔

اُس نے کچھ زیرِ لب کسی زبان میں نا آشنا اور اجنبی زبان میں کہا اور پھر سینے کے ساتھ رومال میں لپٹی کتاب کو کھولا "قرآن---" اُس نے کہا۔

"اِسے پڑھو---" مونا نے کہا۔

اُس نے سر جھکا کر مقدس حروف پر انگلی رکھتے ہوئے اٹک اٹک کر پڑھنا شروع کیا اور وہ ہم زبان ہو گیا۔ وہ جو کچھ پڑھتا تھا وہ ہمیں اُس کی قربت میں لاتا تھا۔ مونا اپنا دوپٹہ ماتھے پر کھینچ کر اُس کا تلفظ درست کرنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی عقیدت اور تشکر کا اظہار آیا جو کسی زبان کا محتاج نہ تھا۔

وہ دن بھی عجیب دن تھے۔

ہم نشیب کی--- میدانوں کی--- اپنے گھر کی حقیقت سے کٹ چکے تھے--- پچھلی زندگی سے منقطع ہو چکے تھے--- فیری میڈو ہی گھر تھا، زندگی تھی---

عجیب دن تھے۔

اور اس عرصے میں--- ہماری خیمہ بستی کے سفید دھوئیں پر اُڑتی--- سٹرابیری کے پھولوں کے فرش کو جھکتی ہوئی دیکھتی قاتل چوٹی--- اور یہ خطاب کتنا نا روا اور ناانصافی پر مبنی ہے کہ کونسی ایسی بلندی ہے جسے اپنے آپ کو روندنا ناگوار نہ گذرے--- کونسا ایسا کنوارپن ہے جو اپنے آپ کو پامال کرنے کی اجازت دیتا ہے--- میرے ذہن پر سوار رہی۔

مشائلہ اور تھامس میرے ہم سفر تھے نانگا پربت کے بیس کیمپ کی جانب---

اور پھر ایک گلیشیر کی دھوپ میں نرم پڑتی برف میں پوشیدہ کسی دراڑ کے خوف سے ہم واپس ہوئے تھے، اور واپسی پر ایک خشک نالے کی گذرگاہ کو عبور کرتے ہوئے میرے قدموں تلے کے پتھروں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور میں رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر ایک بے بس پینڈولم کی طرح جھولتا تھا اور تھامس میرے ہاتھ کو جکڑے چیختا تھا "بائیں ٹانگ سے چٹان میں اور دائیں ہاتھ سے---"

اور جب اُس نے مجھے موت کے منہ سے نکال کر ڈھلتی شام میں گرتی برف کے گالوں میں اُس بلندی پر ڈھیر کیا تھا تو میری جیب میں--- میرے بٹوے میں--- میرے بچوں کی تصویریں اُس برفانی موسم کی شام میں حدت دیتی تھیں--- آج بھی گیارہ برس بعد--- کبھی کسی سرد رات کے پچھلے پہر میری کلائی میں ٹیس اُٹھتی ہے--- ہم بیس کیمپ تک نہیں پہنچ سکے تھے--- اور یہ خلش باقی رہی۔

ایک روز جب ہم اپنے اپنے "پائی پیلس" سے لوٹے--- اور یہ اُس مقام کا نام تھا جہاں ہم سویرے سویرے اُن ضروریات کے لئے جاتے تھے جن کے لئے پیغمبر اور اوتار بھی مجبور تھے--- اور ایسے "پائی پیلس" روئے زمین پر کسی بھی شہزادے یا شہزادی کے

نصیب میں نہیں تھے۔ وہاں قدیم جنگل میں راستوں سے ذرا ہٹ کر چیڑ کے دراز قد درختوں کی درمیان، وہاں نیلے پیلے اور جامنی رنگ کے پھولوں کے درمیان--- نانگا پربت کی سفیدی کی روشنی میں ہمارے "پائی پلیس" تھے اور ہم وہاں بیٹھتے ہوئے بہت شرمندہ ہوتے لیکن مجبور تھے--- تو وہاں سے لوٹتے ہوئے ایک دُھند آلود صبح میں--- میں نے سمیر سے کہا "یار میرا دل چاہتا ہے کہ نانگا پربت کا بیس کیمپ دیکھا جائے، کیا خیال ہے؟"

"کیا خیال ہے؟" اس نے اپنی بلند قامتی پر ذرا پشیمانی سے مجھ پر جھکتے ہوئے کہا "تو آپ بھول گئے ہیں کہ نانگا پربت کی روپل سائیڈ پر میں پہلا پاکستانی بچہ تھا جو بیس کیمپ تک اپنے قدموں پر چلتا ہوا پہنچا تھا اور وہاں میں نے پاکستانی پرچم بھی لہرایا تھا۔ تو ادھر فیئری میڈو سائیڈ کا بیس کیمپ--- نو پرابلم"

"کیوں سلجوق!" میں نے اپنے پرنس آف ویلز سے بھی مشورہ کیا۔

"بیس کیمپ کدھر ہے؟" اس نے اپنی پونی ٹیل کو کھول کر پھر سے باندھا۔

مونا فوراً تشویش میں مبتلا ہو گئی "یہ وہی جگہ ہے ناں جہاں آپ لٹک گئے تھے--- کیا ضرورت ہے جانے کی"

"خطرہ نہیں ہے بیگم صاحب---" ہمارا گائیڈ سُرخ رو آرش خدوخال والا سرخ ریش شکور تھا "تھوڑا گلیشئر ہے۔ تھوڑا برف میں دراڑ ہے--- تھوڑا ہوا میں آکسیجن کم ہے اور تھوڑا ہانپ ہے لیکن خطرہ نہیں ہے"

اُس سویر ابھی سٹرابری کے پتوں پر اوس کی ٹھنڈک تھی، کارن فلیکس اور ہسپانوی آملیٹ کے ناشتے کے بعد بیس کیمپ نانگا پربت کے لئے کوچ ہوا---

جنگل کے بلند کناروں پر ایک پگڈنڈی سی تھی جہاں رائے کوٹ گلیشئر کے عین اوپر چٹانوں میں سے جامنی رنگ کے پھولوں کے گچھے لٹکتے ہیں اور سرد ہوا کے زور سے جھولتے ہیں--- وہاں ہم چلنے لگے۔ وہ پربت جس کے قدموں تک پہنچنے کے ہم آرزو مند تھے صاف اور نیلگوں موسموں میں کہ سویر کی دھند اب چھٹ چکی تھی، اتنا سفید تھا کہ سیاہ چشموں کے باوجود اُس کی تک سے آنکھیں چندھیاتی تھیں۔ دائیں جانب فیئری میڈو کا جنگل ساتھ ساتھ چلتا تھا اور اس کے گھنے اندھیرے کے اندر جو پنچھی اُڑان کرتے تھے اُن کی آوازیں بائیں طرف کی کھائی میں بہنے والے رائے کوٹ نالے کے شور میں بھی الگ الگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

نانگا پربت کی سفیدی کے پس منظر میں سمیر، سلجوق اور عینی کی پیلی پی کیپس زرد

پرندوں کی طرح اُڑان کرتی چلی جا رہی تھیں۔

نیچے بیال کیمپ تھا--- سرو اور صنوبر کے گھنے ریچھ نما پودے از حد تیز رفتار نالے کے آس پاس ست پہرے داروں کی طرح ہمیں قریب سے گزرتے دیکھتے تھے اور ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔

فیئری میڈو میں نانگا پربت تاریک جنگل پر ابھر کر سفید اور سنگ دل تو نظر آتی ہے لیکن بیال کیمپ میں اُس کے رُخ پر جنگل کا سیاہ حجاب نہیں ہے۔ یہاں مزید قربت اور وصال کی خواہش لئے آپ کے سامنے یُوں نہاں کرتی ہے کہ صبح کی دھوپ کی گرمی سے کھسکتے ہوئے برفانی تودے جب ایوالانچ کی صُورت گرتے ہیں تو آپ لاشعوری طور پر اُن کی برفانی دھول سے بچاؤ کے لئے ذرا پیچھے ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک ہلکا سا سنیک ہوا--- عینی اور مونا اس راستے کے عین نیچے جو دیامیر رُخ کے بیس کیمپ کو جاتا ہے، ایک سفید ندی کے شور میں بیٹھ گئیں۔

"بیگم صاحب ادھر گیارہ بجا ہے۔ تو ہم جائے گا ادھر جدھر گڑوم گڑوم کر کے پتھر گرتا ہے اور جدھر بیس کیمپ ہے--- ادھر جرمن لوگ کی قبر کو سلام کر کے تین بجے سے پہلے واپس آئے گا--- آپ انتظار کرو---" شکور نے مکمل پروگرام پیش کر دیا۔

عینی نے اپنا پورٹ ایبل ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور سیاہ چشمہ اُتار کر میری جانب رُوٹھی ہوئی نظروں سے دیکھا کیونکہ مرد حضرات نے فیصلہ کیا تھا کہ بیس کیمپ تک پہنچنا خواتین کے بس کی بات نہیں---

"بچوں کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں تو ذرا احتیاط کیجئے گا---" مونا نے ایڑیاں اٹھا کر بمشکل "بچوں" کو باری باری چُوما--- البتہ مجھ پر اس قسم کا التفات کرنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔

"ہم شاید دو بجے تک ہی لوٹ آئیں۔ آپ دونوں یہاں ریلیکس کریں اور برفانی تودے گرنے کی گڑگڑاہٹ سے لطف اندوز ہوں---"

ایک مقامی گڈریے کو اُن کا "شیمپران" مقرر کر کے ہم چاروں اُس عظیم الشان پتھر کی جانب چلنے لگے جس کے پہلو میں سے جو رائے کوٹ گلیشئر کے عین اوپر بھربھری چٹانوں اور کھسکتے پتھروں میں تھا۔ شائلہ اور تھامس کے ہمراہ میں اسی راستے پر دل کو پتھر کر کے چلا تھا اور مجھے امید تھی کہ ان چند برسوں میں اس کی خطرناکی کند ہو چکی ہوگی، لیکن وہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح تیز دھار والا خنجر تھا جس پر چلنا شاید نیاگرا آبشار کے آر پار تنے رسے پر چلنے سے زیادہ ہولناک تھا۔ ہم چند قدم گئے ہوں گے جب پہلا پتھر ہمارے

قدموں میں سے کھسک کر گڑوم گڑوم کرتا رائے کوٹ کے تکونے اہراموں کی برفیلی کائنات میں جا گم ہوا۔ پھر میرا پاؤں پھسلا اور میں بمشکل سنبھل پایا۔۔۔

"یہ تو خطرناک ہے شکور۔۔۔"

"خطرناک تو نہیں ہے صاحب۔۔۔ آپ کا وزن زیادہ ہے۔۔۔"

"کوئی اور راستہ نہیں؟"

"ہے۔۔۔ پر اس پر دیر لگے گا۔ ادھر واپس جا کر برچ کے جنگل کی چڑھائی کے بعد گنالو گلیشئر کے پار جانا ہوگا۔۔۔ ادھر راستہ ہے"

"تو پھر ہم ادھر سے چلیں گے۔۔۔"

ہم بمشکل شکور کے سہارے ایک ایک کر کے رائے کوٹ گلیشئر پر اگلے بھربھرے راستے سے ادھر آئے اور اسی بڑے پتھر کے سائے میں سانس درست کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔

نانگا پربت جو ابھی مکمل طور پر عیاں تھی۔ اس پر کہیں کہیں بادلوں کے پیراہن اترنے لگے اور کہیں اس کی برہنگی دل پذیر تھی۔

جھاڑیوں میں اور ان پر نانگا پربت کی سفیدی اور ٹھنڈک اثر کرتی تھی ان میں کہیں ایک گگو بولا۔۔۔ گو گو۔۔۔ گو گو۔۔۔ کہاں ہے، کہاں ہے، عمیر نے شور مچا دیا۔

"اُدھر" شکور نے اشارہ کیا۔

سلجوق اور عمیر اپنے آپ کو ساکت کئے اُدھر دیکھنے لگے جدھر ایک گگو بولتا تھا۔۔۔ میں نے اُسے بہت تلاش کیا۔۔۔ اپنی آنکھوں کو ایک پرندے کی طرح اڑان دی۔۔۔ کبھی اس پتھر پر۔۔۔ کبھی اس جھاڑی میں۔۔۔ کبھی اس گھاس میں جہاں جابجا سفید پھول سرہلاتے تھے۔۔۔ وہ کہاں ہے۔۔۔ اس کی آواز مسلسل میرے کانوں میں آ رہی تھی۔۔۔ گو گو۔۔۔ گو گو۔۔۔ اور وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"نظر آیا ابو؟"

"ہاں۔۔۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

شاید اس کے رنگ ایسے تھے کہ میری آنکھیں اُسے دیکھ نہیں سکتی تھیں۔۔۔ میں اس کے لئے کلر بلائنڈ تھا۔ اس کی آواز مسلسل میرے کانوں میں کوک رہی تھی اور اس لمحے ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور نانگا پربت پر سے سفید دھول کا ایک صحرا نیچے آنے لگا۔

"اڑ گیا۔۔۔" سلجوق یکدم بولا۔

وہ اگر میرے بیٹے نہ ہوتے تو میں کبھی ان کی بات پر اعتبار نہ کرتا۔ یہی سمجھتا کہ گو گو وہاں نہیں تھا اور وہ مجھ سے دھوکہ کرتے تھے۔۔۔ یہ بہت الجھا دینے والا احساس ہے کہ ایک آواز مسلسل آپ کے کانوں میں آتی ہو۔۔۔ اور آپ اُسے دیکھ نہ سکیں۔۔

برچ کے سفید جنگل کی چڑھائی میرے لئے بہت اذیتناک تھی۔۔ اس کا زاویہ ایسا تھا کہ درخت بھی جھکے ہوئے تھے بلکہ ترچھے نظر آتے تھے۔۔ ہر دو چار قدم کے بعد میرا سانس اور ارادہ ساتھ چھوڑ دیتے۔ ایک بج گیا اور ہم ابھی برچ کے جنگل میں تھے۔

"شکور۔۔ بیس کیمپ کتنا دور ہے؟"

"ابھی تھوڑا دور ہے صاحب۔۔۔"

"ہم نے تین بجے سے پہلے بیال کیمپ واپس پہنچنا ہے شکور۔۔ میری بیوی اور بیٹی وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔۔۔"

"تو پہنچیں گے صاحب۔۔۔"

دو بجے کے قریب ہم نے اپنے سامنے ایک وسیع اور طویل گلیشئر کی برفوں، پتھروں اور ان میں سے جنم لینے والی ندیوں کو اپنے سامنے پایا۔

"یہ گنالو گلیشئر ہے صاحب۔۔۔ بس اس کے دوسری طرف جو پہاڑی ہے اور برف اور گھاس ہے ادھر بیس کیمپ ہے۔۔۔"

"اس میں۔۔۔ گلیشئر میں دراڑیں تو نہیں۔۔۔"

"گلیشئر میں دراڑ تو ہوتا ہے صاحب۔۔۔ جیسے ندی میں پانی ہوتا ہے، جنگل میں درخت ہوتا ہے ایسے گلیشئر میں دراڑ تو ہوتا ہے صاحب۔۔ لیکن زیادہ نہیں ہے، اللہ مالک ہے"

یہاں مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔۔۔ اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لانے کی حماقت کا احساس۔۔۔ اور ان کے ہر قدم کے نیچے میرا دل مسلا جاتا تھا کہ پتہ نہیں یہ قدم کہاں پڑے۔ ہم گلیشئر کے بلند کنارے سے نیچے اترے اور فیری میڈو کے جادو سے کٹ کر برف اور پتھر کی کائنات کا قصہ بن گئے۔

ہمارے قدموں تلے ایک برف گہرائی تھی جو پتھروں اور سنگریزوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور دھوپ کی تیزی سے پگھلنے والے تودوں سے جنم لیتے ہوئے ندی نالوں کی مدھم آوازیں تھیں۔ گلیشئر ختم ہوا تو دوسری جانب اس کے کنارے کی دیوار دیکھنے میں ناقابلِ عبور لگتی تھی۔ شکور نے ہمیں سہارا دیا۔ ہم پھسلتے اور گرنے کے خوف سے بچتے اوپر پہنچے۔۔

تین بج چکے تھے۔

"کتنی دُور شکور؟"

"پاس ہے صاحب --- وہ سامنے دکھائی دیتا ہے"

ہم اب نانگا پربت کے وجود کا ایک حصّہ بن چکے تھے۔ وہ ابھی ہمارے اوپر سفید ہو رہی تھی اور ابھی دھیرے دھیرے بادلوں میں ملفوف ہونے لگی۔ موسم خراب ہو رہا تھا اور میرا دل بیٹھ رہا تھا۔ تین بج چکے ہیں۔ بیال کیمپ کی تنہائی میں ایک ندی کے کنارے --- عینی اپنی آخری کیسٹ سُن چکی ہوگی۔ موٹا گھاس پر ٹہلتی --- نانگا پربت کو تکتی اپنے بیٹوں کی واپسی کی منتظر ہوگی اور ماؤں کی بے چین فکرمندی میں --- نروس ہو رہی ہوگی -- کیا ہمیں ابھی لوٹ جانا چاہئے --- لیکن ہم اتنے قریب تھے۔

"سلجوق کیا خیال ہے؟"

"تو --- وہ سامنے ہی تو ہے۔ اُس ہاتھی نما سیاہ بلندی کے پہلو میں --- شکور کہتا ہے --- نزدیک ہے"

پہاڑی گائیڈ کے لئے ہر شے نزدیک ہے --- وہ اپنے ماحول اور اپنے فاصلوں میں ہوتا ہے جن میں وہ زندگی کرتا ہے --- یوں بھی اگر وہ ہر سیاح کو یہ کہہ دے کہ نہیں بہت دور ہے تو اُدھر کون جائے گا اور اُس کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ اگر ہم شکور سے دریافت کرتے کہ ہم نانگا پربت کی چوٹی پر پہنچ کر شام سے پہلے بیال کیمپ لوٹ سکتے ہیں اور دور تو نہیں تو وہ یقیناً اپنی مہندی رنگی داڑھی کھجا کر کہتا نزدیک ہے صاحب ---

گناہو گلیشیر کے پار --- اُن وسوسوں اور خدشوں سے بھرے دن میں ایک میدان تھا جس میں بلندیوں پر نمودار ہونے والے ان چھوئے اور ان گنت پھول تھے جنہیں جھک کر غور سے دیکھنے اور اُن کے رنگوں کو اپنی انگلیوں میں سمونے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا --- لیکن دل کے گرد جو فکرمندی کا سیاہ بادل تھا اُس کے کناروں پر چاندی رنگ کا ایک گوٹہ کناری ضرور چمکتا تھا کہ ہم نانگا پربت کے دامن میں ہیں --- اوپر جہاں مقامی روایتوں کے مطابق برف کے سفید مینڈک اور برف کے سانپ برف کی ملکہ کے برفیلے محل کے پہرے دار ہیں ہم اُس کے دامن میں ہیں اور ہم چاروں کے سوا وہاں --- اور کوئی نہیں۔

دھوپ زرد ہو رہی تھی --- اُس کی زردی میں ٹھنڈک کا پہلو بدن پر اثر کرتا تھا --- سائے لمبے ہو رہے تھے اور نانگا پربت کی برفوں کے عین نیچے ہمیں پتھروں کے ایک ڈھیر پر ایستادہ صلیبیں اور کتبے دکھائی دیئے۔

"ہم بیس کیمپ پہنچ گیا صاحب --- مبارک ہو" شکور نے پہلی بار اپنی گرم ٹوپی

کھسکا کر اپنے گنجے سر کو کھجایا۔

بالآخر بیس کیمپ نانگا پربت ---

چار بج چکے تھے --- اور دھوپ زرد ہو رہی تھی --- نانگا پربت کی برفیں ہمارے بدن کا ایک حصّہ بن کر اس میں ایک خاموش سی ٹھنڈک اُتار رہی تھیں۔

"اور صاحب ---" شکور اپنے سر کو کھجانے کے عمل سے فارغ ہو کر بولا "میرے خیال میں جو چھوٹا ثمیر صاحب ہے اِس سے چھوٹا لڑکا اِدھر بیس کیمپ کبھی نہیں پہنچا --- یہ پہلا ہے۔"

"پہلا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا شکور ---" ثمیر نے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا "ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ یہی کافی ہے"

چار بج چکے تھے، اور دھوپ کی زردی گہری ہو رہی تھی۔

سلجوق نے اپنے رُک سیک میں سے کوکاکولا کا ایک ٹن نکالا اور اُسے کھول کر ایک طویل گھونٹ بھرا --- اور اوپر دیکھا جہاں بادل گہرے ہو رہے تھے۔

ثمیر نے میدان کی گھاس میں نمایاں ہوتے چند نیلے پھول توڑے اور انہیں اپنی پی کیپ میں اُڑس کر اوپر دیکھا --- "اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم کیمپ وَن تک ضرور جاتے"

یہ کیا مقام تھا --- یہ کیسا دیار تھا۔

ایک ابدی تنہائی اور اس میں اُترتی خوف اداسی کے گھیرے میں ہم چاروں اُن جرمن کوہ پیماؤں کی قبروں کے سرہانے بیٹھے کوکاکولا کے ٹن میں سے ایک ایک گھونٹ بھرتے اپنے سروں پر بلند ہونے والے برف پربت کو تکتے تھے اور بلندی کے پھولوں کی تیز اور سر کو چکرا دینے والی مہک سے ہمارے گلے خشک ہوتے تھے --- ہم غافل ہو گئے کہ یہاں سے رائے کوٹ گلیشیر کے آخری کنارے پر ایک سرسبز ٹکڑا جو بمشکل نظر آتا ہے وہ فیری میڈو ہے اور اُس کے نیچے کہیں بیال کیمپ میں ایک پُرشور ندی کے کنارے عینی اور میمونہ ہماری منتظر ہیں --- اور اُن کی فکرمندی --- تشویش کی سرحدوں کو پار کر کے پاگل پن میں داخل ہو چکی ہوگی --- ہم غافل ہو گئے ---

ایک صلیب پر الفرڈ ڈرکسل ۱۹۳۴ء-۱۹۰۰ء درج تھا۔ میری پیدائش سے بہت پہلے یہ کوہ پیما اِدھر آیا --- اور اُس کے لئے یہ مٹی منتظر تھی۔ اس کے نصیب میں یہ مقام یہ دیار تھا۔ وہ کروڑوں دوسرے جرمنوں کی مانند --- کسی دیدہ زیب منصوبہ بند قبرستان میں بھی ہو سکتا تھا۔ اگر زندہ رہتا تو دوسری جنگ عظیم کا ایندھن بھی بن سکتا تھا۔ ہٹلر کے

کسی "آخری حل" کے کیمپ میں گیس چیمبر میں بھی جا سکتا تھا--- لیکن وہ یہاں تھا--- اپنی محبوب چوٹی کے سفید دامن میں ایک تنہا اور سرسبز گھاس کے میدان میں آرام کرتا تھا--- دوسری قبر ولی مرکل کی تھی اور آج بھی نانگا پربت کی ایک کھائی مرکل گلی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

"ابو--- بادل ہٹ رہے ہیں" سمیر نے میرے کندھے کو تھپکا۔

بادل ہمارے لئے ہٹ رہے تھے کہ ہم اتنی دور سے آئے تھے اس پوشیدہ حسن کو دیکھنے کے لئے---

نانگا پربت کی چوٹی آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگی--- ایک الہام اور ایک مقدس صحیفے کی طرح--- اس پر ڈھلتی شام کی دھوپ ایک زرد گہنے کی طرح سجی تھی۔

"چیک کرو یار---" سمیر نے سلجوق کو شکور سے مستعار شدہ دوربین تھما دی "وہاں کچھ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

سلجوق نے دوربین آنکھوں سے لگا کر نانگا پربت کو فوکس کیا "ہاں یار--- وہاں کچھ ہے--- جو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا---"

گنڈلو پیک اور برزل پیک پر شام کی زردی زیادہ گہری ہو رہی تھی--- اس کی بڑھتی ہوئی تاریکی کو دیکھ کر ہم خواب غفلت سے بیدار ہوئے--- ہمیں واپس جانا تھا۔

لیکن اس سے پیشتر میں نے ایک اور آزردہ خواہش کی--- میں دوبارہ یہاں آؤں گا ایک خیمے کے ساتھ اور ادھر کچھ دن گزاروں گا--- یہ گھاس میرے بوجھ تلے دبے گی--- کسی شام دھوپ کی زردی میں میرا خیمہ زرد ہو گا--- اور مجھے کہیں بھی واپس نہ جانا ہو گا--- اور آزردہ خواہشیں بھی کبھی پوری ہوئی ہیں---

سمیر اور سلجوق تیزی سے چل رہے تھے اور ان کی پی کیپس میں سے نیلے اور جامنی پھول لٹک رہے تھے۔

گنالو گلیشیر کو ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پا کر میں نے تعجب کیا تھا--- یہ ممکن نہیں لگتا کہ ہم اسے عبور کر کے آئے ہوں اور اب دوبارہ اس کے پار جا سکیں گے۔

برچ کے سفید اور ڈھلوان جنگل تک پہنچتے پہنچتے شام گہری ہونے لگی۔ چھ بج چکے تھے۔ ہم اپنے قدموں پر اختیار نہ رکھتے ہوئے--- میمونہ اور عینی کے خدشوں میں جلتا--- اتنی دیر کر دینے پر شرمندہ اور شرمسار، ٹھوکریں کھاتے ہوئے، اپنی جان سے لاپرواہ--- نانگا پربت سے منہ موڑے اور اُسے کوستے ہوئے--- برچ کے سفید تنوں کو بھی نیم تاریکی میں دھندلاتے دیکھتے--- تھکن سے چور اور سورج کے ڈھلنے سے سردی

کی شدت محسوس کرتے--- ہم اپنے قدموں پر اختیار نہ رکھتے ہوئے چلتے جاتے تھے--- اور گہری فکرمندی کی خاموشی میں چپ چلتے جاتے تھے۔

خدا خدا کر کے برچ کے جنگل کا اختتام ہوا اور ہم بڑے پتھر کے قریب پہنچ گئے جہاں ککو بولتا تھا--- ہم دم لینے کے لئے رُکے--- اور پھر خدشوں میں جلتا ہو کر فوراً ہی اٹھ بیٹھے--- چلنے لگے تو میں نے دیکھا کہ سلجوق اپنا سر تھامے ایک پتھر پر--- ہم سے لاتعلق جھکا ہوا بیٹھا ہے جیسے ہماری موجودگی سے غافل ہو۔

"سلجوق---"

اس نے سر نہیں اٹھایا--- میں اس کے پاس گیا "چلو بیٹا---"

اس نے سر اٹھایا--- وہ ایک مختلف سلجوق تھا--- اس کا رنگ پیلا پھٹک تھا۔ آنکھوں میں زردی تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا اور بے بس تھا "میں چل نہیں سکتا ابو--- میں--- آئی ایم سوری ابو--- آپ مجھے یہیں چھوڑ جائیں--- امی اور عینی انتظار کر رہی ہوں گی"

"بیٹے ہمت کرو---"

"نہیں ابو---" اُسے بولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور وہ اس پتھر پر بیٹھا بیٹھا دائیں ہاتھ کو ذرا سا لڑھک گیا---

"اسے ہائٹ ہو گیا ہے سر---" شکور نے فوراً اسے سہارا دیا۔

اس پر بلندی کا اثر ہو چکا تھا۔

یہ ہماری ناقص اور احمقانہ منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا--- ہم تقریباً خالی ہاتھ فیری میڈو سے نکل آئے تھے۔ ہمارے پاس نہ کوئی مشروب تھے اور نہ باقاعدہ خوراک--- اور یہ میری غلطی تھی۔ مجھے تو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اتنی بلندی پر ان کی کمی بدن کو کس طرح نڈھال کر کے بیمار کر سکتی ہے---

میرا ذہن ماؤف ہونے لگا--- کبھی ایک بیٹے کو اپنے باپ کی حماقت کی قیمت ادا کرنی پڑ جاتی ہے۔ کیا میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا--- ڈھلتی شام میں اور فیری میڈو کے گھر سے بہت دور نانگا پربت کی قربت میں--- میرے سلجوق پر بلندی نے جانے کہاں تک اثر کیا تھا--- اور وہاں کوئی نہیں تھا جو ہماری مدد کو آئے---

سمیر اپنے بھائی کو بے بسی سے دیکھتا تھا اور پھر مجھے دیکھتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔

"بیٹے ہمت کرو---" میں نے کوشش کی کہ وہ میری بھیگتی آنکھوں سے بے خبر رہے لیکن اُسے تو کچھ خبر نہ تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور وہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

شکور نے اُس کا دوسرا بازو تھاما لیکن وہ چل نہیں سکتا تھا۔

"ایسا کرو صاحب---" اُس نے سلجوق کو ڈھارس دی "آپ پیچھے سے میری گردن کے گرد اپنے دونوں بازو ڈالو--- اور مجھے طاقت سے پکڑے رکھو۔ میں آپ کو واپس لے کر جاؤں گا انشاء اللہ---"

یہ عجیب وحشت ناک تصویر تھی میرے سامنے--- بڑے پتھر سے آگے گہری ہوتی شام کی نیم تاریکی میں سلجوق، شکور کی گردن میں بازو ڈالے اُس کی پشت پر سر رکھے، ایک ڈھلوان راستے پر کبھی قدم اٹھالیتا ہے کبھی گھسٹتا ہے--- شکور نے اس کے دونوں بازو اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں ذرا جھکا ہوا اُس کے بوجھ سے چلتا جاتا ہے--- عمیر اور میں--- سہمے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں--- اب کیا ہوگا--- اور میں زیرِ لب کچھ نہ کچھ پڑھتا جاتا ہوں اور اپنے بیٹے کے لئے دعا کرتا ہوں--- کبھی ذرا آگے ہو کر میں اُسے تسلی دیتا ہوں لیکن وہ چپ ہے اور اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور وہ اپنی جواں مردی کی تمام تر ہمت سے شکور پر کم سے کم بوجھ ڈالنا چاہتا ہے--- اپنے پاؤں پر اپنا بوجھ ڈالتا ہے تو اُس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں---

اور جب روشنی مدھم ہو کر اس نیم تاریکی میں گئی جس میں راستہ دیکھنا مشکل ہونے لگا--- جھاڑیاں اور پتھر سیاہ ہو کر اپنی شناخت گم کرنے لگے--- جب شکور کے کندھوں پر بوجھ ڈالے سلجوق کا بیمار بدن مدھم جھاڑیوں اور نادیدہ پھولوں اور گھاس پر گھسٹتا جا رہا تھا--- اور میرے اندر باہر وسوسے تھے--- تب--- بیال کیمپ کی جانب سے ہم نے دو سایوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا--- یہ کون ہو سکتے ہیں--- اس ویرانی اور برفانی علیحدگی میں کون ہو سکتا ہے--- سائے قریب ہوتے گئے کہ وہ تیزی سے چل رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں---

"تارڑ صاحب---" اُن میں سے ایک آگے ہوا۔

"جی---"

"میں خوشحال خان ہوں---"

---اور میں نے اس نیم تاریکی میں بھی اُسے پہچان لیا--- کئی برس پیشتر جب ہم نے ایک رات روشن الاؤ پر مزید لکڑیاں اس لئے نہیں ڈالی تھیں کہ اُن کی روشنی سے ستارے دکھائی نہیں دیتے تھے، وہ مجھے ملنے آیا تھا--- اس نوجوان کا تذکرہ میں نے "نانگا پربت" میں کیا تھا "جناب مجھے آج ہی اپنے گاؤں میں علم ہوا کہ آپ فیری میڈو آئے ہوئے ہیں تو میں آپ سے ملنے کے لئے نکل آیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ آپ اپنی فیملی کے

ساتھ بیس کیمپ گئے ہوئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے چنانچہ میں وہاں سے بیال کیمپ پہنچا---"

"خوشحال--- وہاں میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو چھوڑا تھا--- تم اُن سے ملے ہو؟"

"ہاں جناب--- وہ دونوں دیامیر کی طرف سے اترتے نالے کے کنارے بیٹھی تھیں اور شاید رو رہی تھیں اور آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ تو میں نے ایک مقامی گڈریے کی رہنمائی میں انہیں فیری میڈو بھیج دیا ہے اس لئے کہ رات ہو جائے تو ادھر جانا مشکل ہو جاتا ہے--- وہ انشاء اللہ پہنچ گئی ہوں گی--- میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو تلاش کر کے لاؤں گا--- ہمارا خیال تھا کہ آپ گلیشئر پر راستہ بھول گئے ہیں یا کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں--- آپ خیریت سے ہیں ناں؟"

"سلجوق کی طبیعت ٹھیک نہیں خوشحال--- یوں کرو کہ تم فوراً بیال کیمپ پہنچو--- ادھر کوئی لوگ ہوں گے؟"

"ہاں صاحب--- ہوں گے"

"اُن کے پاس چائے یا دودھ ہوگا؟"

"بالکل ہوگا---"

"تو تم وہاں پہنچ کر اُن سے کہو کہ دودھ گرم کریں، سلجوق کے لئے--- ہم آرہے ہیں"

"میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں---"

"نہیں، تم چلو"

خوشحال اپنے علاقے کی سختیوں اور غیر متوقع بیماریوں سے آگاہ تھا--- اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں مڑ کر بیال کیمپ کی جانب اترنے لگے۔

سلجوق بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عمیر بار بار اس کے کندھوں کو تھپکتا تھا "یار ہمت کرو--- کچھ نہیں ہوتا"

تاریکی مکمل ہو چکی تھی جب ہم بیال کیمپ کے جھونپڑوں کے قریب ہوئے---

گرم دودھ اور چائے--- ہمارے منتظر تھے---

یہ ہماری خوش بختی تھی کہ وہاں ایک ڈسپنسر بھی موجود تھا جو کسی گاؤں سے اپنے رشتے داروں کو ملنے کے لئے بیال کیمپ آیا ہوا تھا اور اس کے پاس معجزاتی طور پر ڈسپرین کی گولیاں بھی تھیں جو بلندی کے اثرات کو کم کرنے میں بے حد زوداثر ثابت ہوتی

ہے---

میں نے سلجوق کو سہارا دے کر اس کے حلق سے گرم دودھ کے چند گھونٹ اتارے اور پھر ڈسپرین دی۔

وہ ندی دکھائی نہیں دیتی تھی جس کے کنارے ہم میمونہ اور عینی کو چھوڑ گئے تھے---

"وہ بہت پریشان تھیں صاحب---" ایک چرواہے نے بتایا "کسی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اُدھر نانگا پربت کی طرف اگر کوئی جاتا ہے اور اس کے پاس رات گذارنے کا سامان نہیں ہے اور وہ شام سے پہلے واپس نہیں آتا تو اس کے لئے دعا کرتے ہیں تو آپ فیری میڈو جاؤ اور دُعا کرو--- وہ ادھر پہنچ گئی ہوں گی--- فکر کا کوئی بات نہیں۔"

چرواہوں نے الاؤ روشن کر رکھا تھا اور ہم اس کے کناروں پر بیٹھے سوچ میں گم تھے کہ اب کیا کریں۔

ڈسپنسر کہنے لگا "آپ اِدھر رات کرو-- فیری میڈو تک کا راستہ اچھا نہیں، رات کے وقت مقامی لوگ بھی گم جاتے ہیں"

"نہیں ہم نے جانا ہے---" سلجوق سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت بہتر محسوس کر رہا تھا "امی پریشان ہوں گی--- کیوں سمیر؟"

"ہاں یار--- عینی بھی پریشان ہوگی۔ تمہیں اس کا پتہ ہے ناں ذرا پریشان ہو تو بھوں بھوں کر کے روتی ہے اور آنکھیں مچالتی ہے---"

بیال کیمپ میں رات اتر آئی تھی اور سوائے نالے کے شور کے اور کچھ نہ سنائی دیتا تھا نہ سجھائی دیتا تھا۔ فیری میڈو بہت دور تھا--- اور نانگا پربت ہمارے لئے ایک ایسی دراڑ بن چکی تھی جس کے پار بچوں کی ماں اور میری بیٹی تھیں-- "خوشحال ہمیں بہر طور فیری میڈو پہنچنا ہے-- آج ہی رات-- کیا یہ ممکن ہے؟"

خوشحال نے الاؤ کی ایک لکڑی کو گھمایا تو تاریکی میں شرارے بلند ہوئے "مشکل تو ہے لیکن جانا ہے تو پھر جانا ہے"

"کیوں سلجوق؟"

"فکر ہی نہ کریں۔ میں سب سے آگے چلوں گا"

"نو پرابلم---" سمیر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک ایسا سفر تھا جس کی یاد میں صرف مشعلیں جلتی ہیں۔

بیال کیمپ کے گھنے سرو اور صنوبر ہمارے آس پاس تھے اور ہم انہیں دیکھ

نہیں سکتے تھے۔ فیری میڈو کی چڑھائی شروع ہوئی تو مشعلیں روشن کر لی گئیں---

یہ مشعلیں ایسے درختوں کی شاخوں کو اکٹھا کر کے بنائی گئی تھیں جن میں کسی خاص مادے کی موجودگی سے جلنے کی صلاحیت ہوتی ہے--- ان میں کوئی نباتاتی چکنائی ایسی تھی کہ فوراً آگ پکڑ لیتی تھی۔ سب سے آگے خوشحال تھا۔ ہاتھ میں مشعل بلند کئے وہ ہمیں راستہ دکھاتا تھا--

اردگرد سیاہ رات اور فیری میڈو کے جنگلوں کا قدیم سکوت تھا کہ پرندے سو چکے تھے۔

ہم ایک زنجیر میں--- ایک قطار میں بندھے چلے جاتے تھے---

ان راستوں پر جہاں ایک ایک قدم پھونک کر رکھا جاتا ہے--- نظروں سے اوجھل نیچے اتھاہ گہرائی میں رائے کوٹ گلیشیئر کی برفانی آخرت تھی--- وہاں اس رات میں ہم ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے مشعلیں بلند کئے قدم آگے رکھتے چلے جاتے تھے۔ اِن قدموں تلے جو کنکر اور سنگریزے آتے تھے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے کہ وہ کن عمیق گہرائیوں میں لڑھکتے جاتے ہیں-- ہم چلتے جاتے تھے۔ چنگاریاں چھوڑتی یہ شاخوں کی مشعلیں زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دیتی تھیں--- یکدم وہ مدھم ہو کر دھواں دینے لگتیں--- کوئی ایک شخص جنگل میں جاتا اور مزید شاخیں توڑ کر لے آتا اور ہمارا سفر پھر شروع ہو جاتا--

---

اس رات اگر گلیشیئر کے پار برزل کی بلندی پر مارخور کے کسی شکاری نے اپنے چٹانی جھونپڑے میں سے ادھر فیری میڈو کی جانب ان مشعلوں کو دیکھا ہو گا تو وہ خوفزدہ ہوا ہو گا--- اس کے اندر کا آبائی خوف یقیناً جاگا ہو گا جس میں بھوت پریت اور پریاں شامل تھے--- رات میں فیری میڈو کے جنگل کے کنارے اگر روشنیاں حرکت کر رہی ہوں تو ایک طویل فاصلے سے ادھر دیکھنے والے کے ذہن میں کیا کیا ماورائی تصویریں نہ بنتی ہوں گی--- ہم جو اس زنجیر میں شامل تھے ہمیں بھی شک ہوتا تھا کہ یہ ہم نہیں کوئی اور ہے جو مشعلوں کی روشنی میں چلتا ہے---

ہم جنگل کے کناروں سے الگ ہو کر اس کے اندر چلنے لگے--- یہاں تاریکی زیادہ تھی---

اور ہمارے سامنے تاریکی میں ملفوف گھنے درختوں میں ایک روشنی نظر آئی---

ہم قریب ہوئے تو وہاں ہمارا نیلا خیمہ تھا اور وہاں ایک سرد پڑتے الاؤ کے سامنے میمونہ اور عینی بیٹھی تھیں۔

انھوں نے ہمیں دیکھا--- انھیں--- میمونہ نے سلجوق اور سمیر کو گلے لگایا اور نادر گلے لگایا--- اور مینی نے اپنے بھائیوں کو ایک مسکراہٹ سے نوازا--- اُن سے ہاتھ ملایا--- پھر وہ خاموشی سے خیمے کے اندر چلی گئیں۔

اُس کے بعد ہم جتنا عرصہ فیری میڈو میں رہے میمونہ نے مجھ سے کلام نہیں کیا---

اتنے برسوں بعد اب بھی جو سیاح فیری میڈو جاتے ہیں مقامی چرواہے اور پورٹر انھیں یہ کہانی سناتے ہیں کہ کس طرح تارڑ اپنے بیٹوں کے ہمراہ ہیں کیمپ گیا تھا اور گئی رات مشعلوں کی روشنی میں فیری میڈو واپس آیا تھا اور اُس کی بیگم نے اُس کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اگلی صبح اُن کی خوب لڑائی ہوئی تھی۔ وہ اس کہانی میں اپنے تخیّل کو بھی غیر مناسب حد تک شامل کر لیتے ہیں--- اور ان میں میرا دوست ایک آسٹرین دوشیزہ کا اسیر رحمت نبی بھی شامل ہے۔

کم از کم میں فیری میڈو کی لیجنڈ کا ایک حصہ بن چکا تھا---

اب وہاں ایک جھیل بھی ہے جسے وہ لوگ "تارڑ جھیل" کے نام سے پکارتے ہیں۔

چہرہ

"کم اونیل کا آوارہ گرد چہرہ--- اور کھڑکی کھلی تھی"

گلگت ایک جزیرہ ہے---

ننگی، سپاٹ اور اس کے وجود پر تنگ ہوتی چٹانوں میں گھرا ایک--- جزیرہ ہے۔

لیکن اب اس کی تنہائی کم ہو رہی ہے۔ ویرانیاں گھٹ رہی ہیں۔ نئی بستیاں نئے گل و گلزار جنم لے رہے ہیں۔ شاہراہ قراقرم کے کنارے بھی اب اتنے بے آب و گیاہ اور انسانوں سے خالی نہیں رہے جتنے دس گیارہ برس پیشتر تھے--- اور اس جزیرے میں بھی جو کہ گلگت ہے میں ایک پریشان حال مسافر ایک اجنبی نہیں ہوں۔ یہاں اب--- میرے رازداں اور بھی ہیں۔

ہنزہ ٹورسٹ ہاؤس کے چوکور لان میں میزوں پر موم بتیاں جھلملاتی تھیں۔

چٹانیں تاریکی میں گم تھیں اور صرف وہ چہرے نظر آتے تھے جو شام کے کھانے پر مجھے اگلی صبح بلند پہاڑوں کے سفر پر نکلنے سے پیشتر کی اداسی، خوف اور پُر مسرت ہیجان میں جتاتے تھے۔

کم اونیل کا امریکی آوارہ گرد اور پُر اشتیاق چہرہ ہوا سے لرزتی موم بتی کی لَو میں کبھی جیسے حال میں ظاہر ہوتا اور کبھی ماضی کی نیم تاریکی میں چلا جاتا--- وہ ایک خوبصورت خاتون تھی--- لیکن اُس کی خوبصورتی میں نیویارک کا ففتھ ایونیو کہیں بھی نہ تھا--- صرف پہاڑوں کے پیار کی زیبائش اور خوش نمائی تھی--- اُس کے بدن میں وہ پُر حرارت زندگی تھی، سختی اور لچک تھی جو اُسے کسی بھی پُر دراڑ گلیشیر یا کوہستانی بلندی پر توازن قائم رکھنے میں مدد دے سکتی تھی--- اور میں اور میرا بدن--- ہم دونوں کم اونیل کے مخالف سرے پر کھڑے تھے--- اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی--- جیسے میں کسی تھڑ سٹور کے شیلف پر پڑی ہوئی، ایک عرصے سے پڑی ہوئی کوئی شے ہوں-- "تم

جانتے ہو کہ واخان ٹریک--- خطرات سے بھرا پڑا ہے اور بہت کم لوگ ادھر گئے ہیں؟"

میرے لبوں پر جو مسکراہٹ تھی اُس میں خوف بہت تھا لیکن گلگت کی اُس شام میں جھلملاتی موم بتیوں نے میرا بھرم رکھ لیا اور خوفزدہ مسکراہٹ صرف مسکراہٹ دکھائی دی--- "نہیں میں نہیں جانتا"

"چتی بُوئی گلیشر از اے کِلر---"

"اچھا---"

"اور وادئی کرومبر کے بیشتر راستے--- چونکہ وہاں کم لوگ چلتے ہیں واضح نہیں ہیں--- اُن کے نیچے جو ندی نالے ہیں وہ بہت پُرشور اور--- دل میں ہیبت بھرنے والے ہیں"

"اچھا---"

"لیکن تم اُدھر ہی کیوں جانا چاہتے ہو؟"

چنار اِن گلگت میرے لئے قدیم یادوں کی ایک پناہ گاہ ہے--- اس کے اندر داخل ہوتے ہی لاہور سے گلگت تک کے پُرصعوبت فاصلوں کی تھکن ختم ہو جاتی ہے--- سیب کا وہ درخت اب بھی پھلوں سے جھکا ہوا تھا--- چند برس پیشتر ہم نے عباس صاحب کی مدد سے اس کی ٹہنیاں خالی کر دی تھیں اور سیبوں سے اپنی کار بھر لی تھی۔ وہی وسیع اور بلند چھت والا چوبی ڈائننگ روم جس میں سلجوق اور میں بیٹھے رہتے تھے۔ بیٹھے رہتے اور اُس جہاز کا انتظار کرتے تھے جو ہمیں واپس وطن لے جائے---

اور حسب روایت ایک مہربان سفید رنگت والا ویٹر ہمارے لئے سُرخ رُو آڑو کاٹ کر لے آیا--- صاحب آپ کا بہت انتظار تھا---

شی صاحب نے مجھے اور میری ٹیم کو دیکھتے ہی "ستے خیراں" کا نعرہ لگایا اور ہمارے لئے ہماری پسند کے دو کمرے کھول دیئے اور جاتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی "قیصر چیمہ نے سوست سے آپ کے لئے کچھ اشیائے خورد و نوش روانہ کی ہیں"

"شی شی---" میں نے انہیں چُپ رہنے کی تلقین کی۔

ٹیم گلگت پہنچتے ہی تربتر ہو گئی مجھے ہرگز علم نہیں کہ تربتر کیا ہوتا ہے لیکن جس طور ٹیم کے ممبران نے فوری طور پر شیو کی، غسل کیا اور خوشبوئیں لگا کر غائب ہوئی اُسے تربتر ہی کہا جاتا ہوگا---

خالد اور بقاء کے پاس ٹریکنگ کے لئے مناسب بوٹس نہیں تھے۔ وہ گلگت کے

بازاروں میں مردہ یا ناکام کوہ پیماؤں کے سیکنڈ ہینڈ بوٹوں کو اپنے پاؤں میں فٹ کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

میاں صاحب اور شاہد ڈاؤن میٹرس اور واکنگ سٹکس کی تلاش میں سرگرداں تھے اور جماعت خانہ بازار میں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے مشتبہ حالت میں گھومتے تھے۔

نوید البتہ ایک انتہائی نفیس سوٹ اور سلک ٹائی میں نہایت پوپٹ بنا ڈائننگ رُوم کے ایک کونے میں کافی سِپ کرتا ہوا نہایت لاتعلقی سے اُن کوہ پیما خواتین پر نظر رکھتا تھا جو اس خوش شکل نوجوان کی لاتعلقی سے متاثر ہو کر اس پر نظر رکھتی تھیں۔

اور میں کیا کر رہا تھا؟--- میں ایئرپورٹ روڈ پر اشرف امان کے اسسٹنٹ قادر کی جانب اس کے آفس میں جس میں شمالی علاقوں کے پوسٹر اور تصویریں دیواروں کی زیبائش تھیں ایک گمشدہ اور مکمل طور پر حادثہ زدہ چہرے کے ساتھ تکتا تھا کیونکہ اس نے نہایت عاجزی سے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ تارڑ صاحب واخان اور پامیر کو جاننے والا جو گائیڈ ہم نے آپ کے لئے بچا رکھا تھا وہ کل ہی کسی اور مہم کے ساتھ کہیں اور روانہ ہو گیا ہے اور اب پورے گلگت میں اور سو کوس آس پاس کوئی ایسا شخص نہیں جو آپ کو وہاں تک لے جا سکے--- آپ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں اور نگر کی راکاپوشی کے بیس کیمپ میں جا کر چند روز بسر کر آئیں شمشال چلے جائیں--- باقی اشرف امان صاحب نے مجھے ہدایت دی ہے کہ تارڑ صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے۔ آپ یہ فرمائیں کہ میں آپ کا کس طرح خیال رکھوں؟---

واخان پامیر ٹریک جس کے اختتام پر کرومبر جھیل تھی، فیری میڈو، بتورہ، نلتر، راکاپوشی بیس کیمپ یا کنکورڈیا ٹریک نہ تھا جس پر بہت سے قدم جا چکے ہوں، منزلوں اور موسموں کا تعین ہو چکا ہو--- چند برس پیشتر تک یہ ایک "حساس علاقہ" تھا وہاں جانا تقریباً ممنوع تھا۔ افغان پٹی واخان میں سوویت یونین کی موجودگی تھی اور اُس کے سانسوں کی ہواڑ کرومبر اور سونج کی وادیوں میں محسوس کی جا سکتی تھی--- جہاں سے واخان ایک روز سے کم کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔ سوویت یونین نے جب اپنی ہی سپرپاور کے زور سے اپنا شیرازہ منتشر کیا اور افغانوں نے اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی تو حکومت نے اس علاقے کو آوارہ گردوں کے لئے جائز قرار دے دیا۔ اشرف امان--- اپنی مہم جو اور کود پڑنے والی طبیعت کے مطابق وہ پہلا شخص تھا جس نے اس ٹریک کو کوہ نوردوں سے آباد کیا--- راستے درست کئے، نالوں اور دریاؤں کو عبور کرنے کے لئے جھولا برج تعمیر

گئے اور مجھ غریب کو لاعلمی میں اس جانب مائل کیا--- اشرف ایک لاتناہی انداز میں مسلسل بولتا ہے۔ اس کے ہاتھ فضا میں حرکت کرتے ہیں اور وہ اپنی کوہستانی قیصی میں گم ہو جاتا ہے۔ جو شخص کے۔ٹو پر پہنچنے والا پہلا پاکستانی ہو اس کے اخلاص پر آپ شک بھی نہیں کرسکتے اور نہ اسے چپ کرا سکتے ہیں--- تارڑ صاحب آپ کرومبر لیک تک جانا چاہتے ہیں ہاں--- بس چلے جائیے--- آپ یقین کریں وہاں دنیا کی خوبصورت ترین پہاڑی دل کشی ہے--- تارڑ صاحب یہ اتنی لمبی لمبی گھاس ہے--- میرے قد سے اونچی کرومبر میں--- پھول ہیں--- جھیلیں ہیں--- یاک ہیں--- واخی لوگ ہیں--- کوئی پاکستانی ادھر نہیں جاتا--- آپ جائیں--- خطرناک نہیں ہے--- زیادہ سے زیادہ انسان مر سکتا ہے اور یوں بھی کرومبر جھیل دیکھے بغیر مرجانا بھی تو کوئی زندگی نہیں--- اشرف ایک ایسا جادوگر ہے جو سحرزدہ کرکے آپ کو موت کے منہ میں جانے پر راضی کرسکتا ہے--- اس نے صرف لمبی لمبی گھاس اور جھیلوں کا تذکرہ کیا اور کرومبر--- چپنی بوئی اور درکوت گلیشرز کو گول کرگیا---

تو میں اب ایک گمشدہ اور مکمل طور پر حادثہ زدہ چہرہ لئے سامنے بیٹھے قادر کو دیکھتا تھا کیونکہ ان علاقوں کا تجربہ رکھنے والا آخری گائیڈ کسی اور مہم کے ساتھ کہیں اور جاچکا تھا--- اور وہ مجھے کہیں اور جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔

میں گھر سے اس جھیل کی خاطر نکلا تھا جس میں سے نکلنے والے دریا اور ندیاں بلند گھاس میں سفید ہوتے تھے۔

جو ایک عرصہ تک آوارہ گرد آنکھوں اور ان کے خیموں کے لئے ممنوع تھی۔ جو افغانستان کے واخان خطے سے صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر تھی اور جو سرما میں یوں منجمد ہوتی تھی کہ اس پر یاکوں کے قافلے چل سکتے تھے۔

پامیر--- دنیا کی چھت پر، پانیوں کا ایک نیلگوں ذخیرہ جس کی تہہ کے پتھر دکھائی دیتے تھے اور ان پر جو کچھ رقم تھا میں اُسے خواب میں نہیں، حقیقت میں دیکھنا چاہتا تھا--- میں کیسے راکاپوشی یا شمشال کی طرف چلا جاتا---

"آپ میرا خیال اس طرح رکھ سکتے ہیں کہ--- مجھے جھیل کرومبر تک لے جانے والا کوئی گائیڈ مہیا کردیں---"

"سر---" قادر ایک مؤدب اور مددگار شخص تھا "کچن ٹینٹ۔ کھانے پکانے کا سامان، کراکری، خیمے، سب کچھ تیار ہے--- جیپیں بھی مہیا کی جائیں گی اشکومن تک جانے کے لئے--- لیکن--- گائیڈ نہیں ہے---"

جب میں اسی روز جی ایم بیگ بک شاپ میں داخل ہوا تو وہاں میرے اولین شمالی دوست کی موجودگی کی آشنا مہک ابھی تک تھی--- اور وہاں اکرام بیگ تھا "اکرام--- کوئی ایک شخص جو واخان پامیر ٹریک پر گیا ہو اور مجھے وہاں تک لے جاسکے"

اکرام ایک زرد رُو کملاتے چہرے والا نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرایا "نہیں--- اُدھر کم لوگ گئے ہیں۔ میں ایک فرانسیسی گروپ کو بتورا ٹریک پر لے جارہا ہوں۔ وہاں بلندی پر جو چراگاہیں ہیں انہیں دیکھ کر آپ نے جو کچھ آج تک دیکھا ہے بھول جائیں گے--- آپ بھی ساتھ چلیں"

میں کہیں اور جانا چاہتا تھا اور ہر کوئی مجھے کہیں اور لے جانا پر تُلا ہوا تھا

"نہیں--- میں صرف اور صرف کرومبر جانا چاہتا ہوں"

"تو پھر---" اس کی آنکھوں میں اب بھی اس فوکر طیارے کی گمشدگی تھی جو نانگا پربت کے آس پاس لاپتہ ہوا تھا اور اس کے مسافروں میں اس کے والد، جی ایم بیگ بھی شامل تھے "تو پھر تارڑ صاحب--- کِم اونیل کو ملتے ہیں"

کِم اونیل اور اس کا کوہ نورد خاوند "لونلی پلینٹ" کے کتابی سلسلے کے لئے پاکستانی بے مثال شمال کے بارے میں ایک ٹریکنگ گائیڈ لکھ رہے تھے، اور گھر بیٹھ کر نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ایک عرصے سے شمال کے پتھر چھانتے ہوئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر لکھ رہے تھے اور نقشے تیار کر رہے تھے--- کِم کرومبر ٹریک پر سفر کرچکی تھی۔

چنانچہ ہم جنرو ٹورسٹ ہاؤس کے لان میں موم بتیوں کی روشنی میں ایک ایسے نقشے پر جھکے ہوئے تھے جو کِم کی انگلیوں کی جنبش سے جنم لیتا تھا اور میرے دل کی دھڑکن کو تیز کرتا تھا--- راستے اور منزلیں وجود میں آرہی تھیں--- اس نے ابھی ابھی مجھ سے دریافت کیا تھا کہ تم ادھر ہی کیوں جانا چاہتے ہو--- چپنی بوئی گلیشر از اے کلر---

"کِم--- ذرا غور کرو" میں نے نقشے پر اپنی ہتھیلی پھیلادی "میرے ہاتھ کی لکیروں میں کہیں اس جھیل کا نام لکھا ہے؟"

وہ ہنسی--- ایسے ہنسی جیسے ایک ہی قبیلے کے فاترالعقل اور بے بس لوگ ہنستے ہیں "رائٹ--- تم ٹھیک کہتے ہو اس کے لئے کسی جواز کی ضرورت نہیں--- تمہاری ہتھیلی پر اگر جھیل کرومبر کا نام نہیں تو بھی تم اسے خود لکھ سکتے ہو--- ایک آوارہ گرد اپنی قسمت کی لکیروں کو بدلنے پر قادر ہوتا ہے لیکن میں--- وادی اشکومن کی جانب سے اُدھر نہیں

اُتری--- درّہ چیلنجی کی طرف سے گئی ہوں--- اس لئے چیلنجی تک میں تمہیں گائیڈ نہیں کر سکتی--- ہاں اُس کے بعد---" وہ پھر نقشے پر جھک گئی اور چیلنجی کے بعد جو راستے تھے اُن کا نقشہ بنانے لگی--- "اُس کے بعد جب تم ورگوتھ گلیشئر کے عین نیچے ایک جنگل میں اپنے خیمے لگاؤ گے--- اگلی صبح پانچ بجے بیدار ہونا--- اوپر جہاں ورگوتھ گلیشئر کی برفیں ہیں اُن کے اختتام پر ایک گھنا جنگل ہے--- ایک درخت سے دوسرے درخت پر ایسے پرندے اُڑان کرتے ہیں--- اُن کی دُمیں تمہاری ناک کو چھوئیں گی--- ضرور جانا--- پھر سوختر آباد آئے گا اور پھر یہ ہے چٹی بوئی جو دراڑوں سے اٹا پڑا ہے--- گائیڈ کے بغیر کراس نہ کرنا--- پھر سوبج اور اس کے بعد کرومبر لیک اور اُس سے پرے وادی بروغل میں تمہارے سامنے بلندیوں پر یاک سرائے کے دروازے کھلیں گے--- ہاں آخرکار جب تم چکار پہنچو گے تو درکوت پاس--- وہ بھی کوہ نوردوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا---اسے عبور کرنے کے لئے صبح چار بجے بیدار ہو کر دھوپ نکلنے سے پہلے--- اس میں دراڑیں اور بلندی بہت ہے۔"

کِم کی تحریر شدہ ہدایات اور نقشے کو میں نے کسی خزانے کے جزیرے کے نایاب نقشے کی طرح سنبھال کر جیب میں رکھ لیا---

اسی رات میں اور کِم اکرام بیگ کے اس نئے گھر میں گئے جو گلگت کی چٹانوں میں ایک شالیمار باغ کی طرح تختہ بہ تختہ بلند ہوتا تھا---

چناران واپس آیا تو ٹیم کے دونوں کمروں میں رت جگے کا سماں تھا۔

خالد ملتانی ایک خاص رمز آمیز گفتگو کر رہا تھا اور بقاء کے بلند قہقہے سیب کے درختوں کو بھی ہراساں کرنے پر یُوں قادر تھے کہ چند سیب اُس کی بلند آہنگی سے خطا ہو کر زمین پر آ گرے--- نوید ایک پُرجوش انداز میں اپنے کانوں پر چسپاں ہیڈ فون پر اپنے خوابوں اور خیالوں میں گم تھا۔ شاہد، رات کے اس پہر بھی سیاہ چشمہ لگائے--- فلاپی ہیٹ پہنے بُت بنا اس منظر کا مشاہدہ کر رہا تھا اور میاں صاحب اُسے دیکھتے تھے لیکن اُس کی ہیئت پر قطعی کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔

خالد ندیم میرا منتظر تھا۔ کندھے پر رکھا تولیہ جھٹک کر بولا "تارڑ صاحب، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ پچھلی بار تو میں اسکولے سے واپس گیا تھا اور اس مرتبہ گلگت سے ہی کُوچ کر جاؤں گا--- آپ نے ٹیم کی حالت دیکھی ہے؟؟"

"ٹیم کی حالت تو ٹھیک ہے" میاں صاحب نے عینک کو چھوا "البتہ لیڈر کو دیکھو ہاں آدھی رات کے وقت پتہ نہیں کہاں سے اور کس سے مل کے آیا ہے"

"میں کِم اونیل سے مل کر آیا ہوں---"

نوید نے اپنے ہیڈ فون فوراً اُتار دیئے۔ "کیسی تھی؟"

"وہ ایک شادی شدہ جھیل ہے میرا مطلب ہے خاتون ہے اور کرومبر جھیل تک جا چکی ہے---"

کرومبر کو دفع کریں تارڑ صاحب--- اور شادی شدہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے--- آپ کو پڑا ہے" یہ خالد ندیم تھا اور میں اُسے ایک شریف شخص سمجھتا تھا۔

"تو یہ---" شاہد بولا اور رُکا اور ہم تادیر اُسے تکتے رہے پھر وہ دوبارہ بولا "یہ جو نیک بی بی ہے تو ہمارے ساتھ کرومبر جھیل تک چلے گی؟ کم از کم مجھے کوئی اعتراض نہیں"

"اعتراض تو اُسے ہو گا---" میاں صاحب رہ نہ سکے "تمہارا پلپلی ہیٹ اور جاسوسوں والی عینک دیکھ کر"

خالد ندیم نے ایک انتہائی سرد سانس لیا "سر--- ٹیم ذرا بے قابو ہو رہی ہے--- آپ جانتے ہیں کہ پورا ہفتہ ہو گیا ہے بیویوں سے بچھڑے ہوئے--- تو کچھ کریں۔"

"میں کیا کروں؟" نوید نے احتجاج کیا "میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔"

خالد ملتانی کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ کا ظہور ہوا "تو ہم ملتانی حاضر ہیں سائیں---"

یہ عجیب غیر مہذب۔ اخلاق سے گری ہوئی اور نامانم ٹیم تھی۔

ہم جب سوئے تو بہت دیر تک سوئے---

بہت دیر تک سونے کے بعد کہیں خواب کی آلودگی میں ایک دستک سنائی دی۔ میں ناچار اور بہت کوستا ہوا اٹھا کہ اس پہر کون ہے۔ باہر ڈاکٹر نعمت شاہ ازحد مسرور کیفیت میں کھڑے مسلسل مسکرا رہے تھے "آئے ہائے تارڑ صاحب--- گلگت آپ کو یاد نہیں--- ہم آپ کو یاد نہیں--- آپ ابھی سے سو گئے ہیں؟"

"ابھی--- رات کا ڈیڑھ بجا ہے---"

"اگر ہم نہ چاہیں تب بھی اس وقت رات کا ڈیڑھ بج جائے گا--- مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ گلگت میں ہیں اور چناران میں ہیں--- آجائیں"

"کہاں آجائیں؟" میں نے اپنا سر کجاتا ہوا ازاربند دُرست کیا۔

"وہاں آجائیں جہاں آپ کے دوست، آپ کے چاہنے والے آپ کا انتظار کرتے ہیں---"

اور وہاں--- چناروں کے پہلو میں ایک پُرسکون رہائش گاہ تھی جس میں میرے دوست میرا انتظار کرتے تھے۔ خوردونوش کی پر تکلف فراوانی کے ساتھ--- ہنزہ کے مہمان نواز فضل صاحب تھے جن کے بالوں پر اللہ کا فضل ہو چکا تھا اور وہ خوبانیوں کی مٹھاس والی ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ میزبان تھے۔ پی-آئی-اے کے خوش رُو عباس تھے۔ شی صاحب اپنی ٹھیٹھ پنجابی سے چھائے ہوئے تھے اور فرنٹیر کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ ملک صاحب تھے۔ میں اگرچہ تھکا ہوا تھا پژمردہ اور ابھی تک نیند میں تھا لیکن ان چہروں نے دوستی کی ایسی شعاعیں منور کیں کہ میرا چہرہ بھی روشن ہو گیا۔ اہل ہنزہ یہ جانتے ہیں کہ زندگی چار دن کی ہے اور وہ یہ چار دن بحث مباحثے اور خوف کے فلسفوں کو حل کرنے میں نہیں گزارتے۔ وہ اسے--- زندگی کی طرح گزارتے ہیں--- پاکستان میں کتنے لوگ ہیں جو زندگی کو--- زندگی کی طرح گزارتے ہیں۔

ڈیک میں سے ہنزہ کا کوئی لوک موسیقار تانیں بلند کرتا تھا اور موسیقی کے ساتھ عباس اور فضل کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے تھے۔

کھڑکی کھلی تھی۔

اور یہی وہ وقت تھا جب انسان فاصلوں اور زمانوں کی کمند سے آزاد ہو جاتا ہے--- میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے--- ہر ایک کی شالاط الگ--- ہر ایک کا شہر میونخ جُدا---

اور یہ ایسی ساعتیں ہوتی ہیں کہ آپ موجود رفاقت سے بچھڑ جاتے ہیں--- اپنے شہروں میں چلے جاتے ہیں--- ایک گھڑی ایک مشغلہ حیات سے پرے جو گمان ہوتا ہے اس میں چلے جاتے ہیں۔ انسانی ذہن میں جو ایک اور وجود ہوتا ہے اُس سے ملاپ کی کسک دل کو کچوکے دیتی ہے--- اور یہ کیا ہے؟--- فنا کی قربت کی کسک ہے اور کیا ہے--- اس کائنات میں ایک غیر اہم وجود کو موجود میں بدل دینے کا فتور ہے، اور کیا ہے--- عباس کسی اور میونخ میں تھا۔ فضل کے چوڑے ماتھے پر شکنیں ابھرتی تھیں اور میں--- کھڑکی سے باہر اُس درخت کو تکتا تھا جس کے کچے سیب کھڑکی سے فرار ہوتی روشنی روکتے تھے اور ہمیں ان دنیاؤں سے باہر آنے کی ترغیب دیتے تھے۔

کھڑکی کھلی تھی۔

گلگت

"ہم اُزبک لوگ ہیں--- گلگت میں سفر کی رات، شک کی رات"

گلگت کی چٹانوں پر ڈوبتے سورج کی جو زردی تھی وہ انگوروں کے ہرے گچھوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگتی تھی اور وہ پکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں انہیں ایک حریص نگاہ سے تکتا تھا۔

گلگت کے چٹانی جزیرے میں اگلا دن پریشان اور ہراساں احساسات کا دن تھا۔ میں نے ہر اس شخص سے رابطہ کیا جو شمال کو جانتا تھا اور ان میں سے کوئی بھی واخان اور پامیر کے راستوں کو نہیں جانتا تھا۔

میری ٹیم اس معاملے میں ازحد فرمانبردار اور کورنش بجا لا کر سر تسلیم خم کر دینے والی تھی "آپ جہاں لے جائیں گے، چلیں گے--- واخان نہ سہی کہیں اور سہی"

لیکن--- انہیں خبر نہ تھی کہ واخشانی خنجر میرے دل میں اتر چکا ہے--- میں جھیل کرومبر کی آرزو میں لاچار ہو چکا تھا۔ مجھے اس کی جانب ہی سفر کرنا تھا۔ چاہے موت کا فریب جال پھیلائے میرا منتظر ہو۔

آج صبح قادر ایک تھرکتے ہوئے بے چین سے شخص کے ہمراہ میرے کمرے میں آگیا۔ "یہ امین ہے کہتا ہے کہ میں گائیڈ ہوں اور تارڑ صاحب کو واخان لے کر جا سکتا ہوں--- لنک بھی ہے"

میں نے اسے دیکھا--- وہ ایک مسکین قسم کا امین تھا--- بار بار آنکھیں جھپکتا تھا اور اپنی تیز تیز گفتگو سے مجھے متاثر کرنے کے لئے بہت محنت کر رہا تھا۔

"تم واخان اور بروغل تک گئے ہو؟"

"نو پرابلم--" اُس نے کسی جاپانی ٹورسٹ سے یہ تکیہ کلام ادھار لیا تھا۔

"کیا تم واخان اور بروغل گئے ہو اور کیا تم نے چپتی بوئی اور درکوت گلیشیرز عبور

کئے ہیں؟"

امین ہمہ وقت ایک اضطرابی تھرتھراہٹ میں مبتلا تھا "سر میں سوخر آباد تک جا چکا ہوں آگے نہیں-- لیکن میں مقامی لوگوں کی زبان سے واقف ہوں اس لئے اُن سے معلومات حاصل کرکے آپ کو آگے بھی لے جاؤں گا-- نو پرابلم-- اور میں کک بھی ہوں"

وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا لیکن--- میں اُس کی آنکھوں میں وہ مسلسل جھجک دیکھ رہا تھا جو آپ کو فریب میں مبتلا کرنے والے لوگ پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں-- لیکن فقیروں کے پاس چناؤ کا اختیار نہیں ہوتا-- میرے پاس اور کوئی متبادل نہ تھا
"ٹھیک ہے تم پندرہ روز کے سفر کے لئے جتنی خوراک اور دیگر اشیاء درکار ہیں ان کی فہرست بناؤ اور شاہد صاحب کے ساتھ گلگت بازار میں خریداری کرکے شام تک مجھے رپورٹ کرو--"

"نو پرابلم"

لیکن آوارہ گردوں میں خطرے اور بے اعتباری کی جو حس ہوتی ہے اُس نے فوراً سرگوشی کی کہ یہ بندہ اگرچہ معصوم ہے مگر--- جو کچھ کہہ رہا ہے سچ نہیں کہہ رہا--- پہاڑوں کے اندر اس قسم کے کردار آپ کی جان کے لئے بہت مضر ثابت ہوسکتے ہیں لیکن--- میرے پاس اور کوئی متبادل نہ تھا---

پچھلے پہر اظہر نیاز کا فون آگیا--

وہ پتہ نہیں کہاں سے اور کس خفیہ ذریعے سے آگاہ ہوگیا تھا کہ میں گلگت میں ہوں "تارڑ صاحب بڑے افسوس کی بات ہے--- آپ گلگت آئیں اس بندۂ ناچیز اور دل گیر کو یاد نہ کریں-- احمد داؤد آپ کے بارے میں درست کہتا تھا--"

"داؤد کسی کے بارے میں کیا درست کہہ سکتا تھا-- وہ خود اتنا نادرست شخص تھا-- ہمیں بھی دغا دے گیا--- لیکن کیا کہتا تھا؟"

"میں آپ کا ادب کرتا ہوں اس لئے اُس کے الفاظ دوہرا کر آپ کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا- بہرحال آپ فوری طور پر چناران سے کوچ کریں اور میرے دولت کدہ پر تشریف لے آئیں"

"اپنے تقریباً درجن بھر ٹیم ممبران سمیت؟"

"اچھا اور لوگ بھی ہیں' پھر بے شک وہیں ٹھہرے رہیں---" اظہر کی بے لگام ہنسی نے مجھے خوش کردیا--- اظہر نیاز کے انتہائی بیہودہ ہیئر سٹائل کو اگر نظر انداز کردیا

جائے تو وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوستی نبھانے اور بچھڑ جانے والے دوستوں کے لئے ہمہ وقت آبدیدہ رہنے والا--- شاید ایک نان پریکٹیکل شخص ہے- میں جانتا تھا کہ وہ ان دنوں آغا خان رورل سپورٹ پروگرام میں میڈیا ایڈوائزر ہے لیکن اپنے سفری بکھیڑوں اور پریشانیوں کے باعث اُس سے رابطہ نہیں کرسکا تھا۔

"آپ آج رات کا کھانا تو میرے ہمراہ کھائیں جناب عالی--- ٹیم کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں" وہ پھر ہنسا۔

"اظہر نیاز--- میں اس وقت شدید آزردگی میں ہوں"

"کوئی شعر سنا کر آزردگی دور کروں؟"

"نہیں--- یہ آزردگی کسی شعر سے نہیں کسی ایسے شخص سے دور ہوگی جو مجھے داخان پامیر ٹریک پر لے جائے"

"آپ فون بند کریں-- میں ابھی دوبارہ کرتا ہوں" کلک-- اور فون بند ہوگیا۔

دس منٹ بعد وہ پھر لائن پر تھا "آج شام کی چائے آپ کریم جان کے گھر پئیں گے-- میں آپ کو پک کرلوں گا" اس سے پیشتر کہ میں چائے کی اس دعوت کو موجودہ ناسازگار حالات میں نامناسب قرار دے کر معذرت کرتا-- فون کی کلک نے رابطہ منقطع کردیا۔

تو اب-- گلگت کی چٹانوں پر ڈوبتے سورج کی جو زردی تھی اُس میں کریم جان کے دیدہ زیب گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے دیواروں اور سہاروں پر پھیلی ہوئی بیلوں سے انگور کے کچے گچھے لٹکتے تھے اور اُس زردی میں وہ پکے ہوئے اور رس بھرے دکھائی دیتے تھے۔

کریم جان کو میں دس برس پیشتر پسو گلیشئر سے آنے والی تیز ہوا کے شور میں--- گئی رات شیسپر ان کے ڈرائنگ روم میں لالٹین کی مدھم روشنی میں مل چکا تھا-- وہ ایک عمدہ فوٹوگرافر تھا--- اور اُس کی تصویروں میں شمال کا جمال بھی تھا اور جلال بھی---

کریم جان کے برابر میں ایک بلند قامت چھریرے بدن کا خاموش طبع نوجوان بیٹھا تھا---

"یہ میرا کزن عبدالاحد ہے-- اور یہ انشاء اللہ آپ کو سوخر آباد تک لے جائے گا--" کریم جان نے گھر میں بنی ہوئی ایک کیک نما شے مجھے تھما دی-- اور وہ بے حد ذائقہ دار تھی۔

"آپ سوخر آباد تک گئے ہوئے ہیں؟"

"جی---" عبدالاحد نے سر جھکائے انکساری سے کہا "وہاں میرے چچا عبداللطیف کا ڈیرہ ہے---ویسے ہم لوگ وادئ اشکومن کے گاؤں اِمت کے ہیں--- کچھ برس پہلے میں سوختر آباد گیا تھا--- میں آپ کو وہاں تک لے جا سکتا ہوں اور اُس سے آگے بھی کچھ بندوبست کر دوں گا کیونکہ مجھے ایک عدالتی پیشی کے لئے جلد واپس آنا ہے---"

"عبداللطیف میرے بھی چچا ہیں---" کریم جان کہنے لگا "ہم لوگ اُزبک ہیں۔ روسی انقلاب کے بعد ہمارے آباؤ اجداد میں سے ایک امیر نے روسیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی برس تک پامیر کے دروں اور بلند علاقوں میں وہ اُن کے خلاف لڑتے رہے اور بالآخر ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ وہ اس سلسلۂ کوہ کو پار کر کے سوختر آباد کی وادی میں اُترے اور وہیں سکونت اختیار کر لی--- ہمارے قبیلے کے کچھ اور لوگ اوپر وادئ سِسفر میں آئے، کچھ گلگت میں آباد ہوئے اور کچھ کاشغر چلے گئے۔ جب سوویت یونین کا اختتام ہوا اور ازبکستان آزاد ہو گیا تو ہمارے بے شمار لوگ ایک قافلے کی صورت میں ازبکستان واپس گئے۔ وہاں ہمارے رشتے دار تھے، قرابت دار تھے--- انہوں نے کہا--- تم ستر برس بعد واپس آئے ہو لیکن تمہارے مکان--- ہم خالی کر دیں گے--- جو زمین تمہاری تھی اُسے ہم ایک امانت کے طور پر کاشت کرتے رہے--- یہ سب کچھ اب پھر سے تمہارا ہے--- چند بزرگ وہیں ٹھہر گئے لیکن نوجوانوں نے صرف اُزبک شناختی کارڈ بنوائے اور واپس آ گئے۔ اُن کے خون میں پاکستان رچ چکا تھا۔ اُن کے لئے ازبکستان ایک یاد ایک سنہری ماضی تو تھا لیکن گھر پاکستان تھا--- یوں بھی روزگار کے مواقع ازبکستان کی نسبت پاکستان میں کہیں زیادہ ہیں۔"

"اُس امّاں جان کا قصّہ بھی سنائیں تارڑ صاحب کو---" احد نے کریم جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں--- ایسا ہوا کہ تاشقند ایئرپورٹ پر جب یہ قافلہ اُترا تو ایک بہت ہی بزرگ خاتون کے پاسپورٹ یا ویزا میں کچھ کمی بیشی تھی۔ امیگریشن کے ازبک افسر نے اعتراض کیا کہ کاغذات درست نہیں اس لئے خاتون ازبکستان میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ اس پر بزرگ خاتون نے اِس افسر کو اعلیٰ ترین اُزبک گالیوں سے نوازا اور کہنے لگیں--- بے شرم شخص جب تم رُوسیوں کے آگے سر جھکا کر بیٹھ گئے تھے، اُن کی اطاعت قبول کر لی تھی--- ہم تھے جنہوں نے اپنا سر بلند رکھا اور غلامی کی بجائے جلاوطنی قبول کی۔ ہم بھی تمہاری طرح اُن کے کارندے بن کر اپنے وطن میں رہ سکتے تھے لیکن--- دربدر ہوئے--- تمہاری یہ جرأت کہ مجھے روکو--- میں تم سے زیادہ اُزبک ہوں، اپنے وطن میں

واپس آئی ہوں کونسا ویزا اور کونسا پاسپورٹ--- ہٹ جاؤ میرے راستے سے--- چنانچہ امیگریشن افسر نے سر جھکا کر معذرت کی، شرمندگی کا اظہار کیا اور--- اور اُن کے راستے سے ہٹ گیا"

شام بے سبب اداسی کی طرح آنکھ جھپکتے ہی بے آواز اُتر آئی۔

پندرہ بیس روز کی کوہ نوردی کے بعد اپنے گھر کو لوٹنا--- اُس چوکھٹ کی جانب جانا جس کے پار آپ کی اپنی دنیا ہے--- ایک عجیب بھری ہوئی--- آنسوؤں سے بھری ہوئی واپسی ہوتی ہے تو ستر برس بعد اُس ازبک خاتون کے لئے گھر کو لوٹنا کیسا ہو گا۔

"آپ یہاں اپنا بندوبست مکمل کریں---" احد ایک پُرکشش ٹھہراؤ سے بولنے والا شخص تھا "میں اِمت کے ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے جو پہاڑی ہے اُس کے نیچے سڑک تک آؤں گا--- اور آپ کو سوختر آباد تک لے جاؤں گا انشاء اللہ---"

"اور پورٹرز؟"

"اِمت میں کچھ کوہستانی لوگ آباد ہیں--- بہترین پورٹرز ہیں"

"کوہستانی ذرا غصّہ والے ہوتے ہیں"

"یہ کوہستانی جو اشکومن میں ایک عرصے سے آباد ہیں--- بہترین لوگ ہیں--- آپ فکرمند نہ ہوں---"

کسی نے پوچھا کہ سفر کی شب کی اداسی کی تہیں کھولیں تو اُن میں سے کیا نکلتا ہے---

تہہ در تہہ---

ندیوں نے جن اوراق کی کچّی روشنائی کو اپنے بہاؤ سے دھو کر سادہ کر دیا ہوتا ہے بس وہی لفظ پھر سے اُبھرتے ہیں--- دیوانگی کے--- پھر سے ملاقات کے--- چناروں میں بجھے بجھے سے چہرے تھے۔

سفر کا جنون اس کی منصوبہ بندی کے دوران ایسا شدید ہوتا ہے کہ رگوں میں اُتر کر آپ کو ہر وقت مست رکھتا ہے۔ آپ دوسرے لوگوں سے بلند اور برتر مقام پر فائز ہوتے ہیں--- لیکن سفر کی رات ہمیشہ شک کی رات ہوتی ہے۔

کل صبح جو کوچ ہو گا کیا وہ ناقابلِ واپسی تو نہیں--- یہ جنون، نامعلوم تک پہنچنے کا--- اس کے حصول کا--- رائیگاں تو نہیں---

نامعلوم آبی ذخیروں- برف بہاؤ ندیوں اور قد آدم گھاس کے ان چھوٹے میدانوں کو آنکھوں کی خواہش کرنا--- ایک دیوانے کا خواب تو نہیں-- کہیں ایسا تو نہیں کہ نارمل لوگ باقاعدہ اور ذی ہوش لوگ جو ہمیں کم عقل جانتے ہیں تو درست جانتے ہیں--

کہیں ایسا تو نہیں---

سفر کی رات ہمیشہ شک کی رات ہوتی ہے-

شاہد عزیز کمرے میں داخل ہوا، چڑمڑ بیٹ اُتار کر اپنے بیش قیمت بالوں کو تھپکا "مائی لیڈر-- ٹریک کے لئے خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت مکمل ہیں-- چیک کر لیجئے"

ہمارا کمرہ کسی حریص ذخیرہ اندوز کے گودام کی طرح مختلف اشیائے ضرورت سے بھرا ہوا تھا- خوردنی تیل کی بوتلیں- آٹے اور چاول کے تھیلے- مصالحہ جات- چینی- پریشر ککر- دالیں- پیاز- آلو- سوپ کے پیکٹ- سُوجی- مٹی کا تیل- گیس لیمپ اور اُس کے بلب- سُوکھا دودھ- اور ان کے علاوہ اسلام آباد سے درآمد شدہ خوراک کے ٹن، بسکٹ، سوئیس-- انڈوں کا سفوف- چپس، مشروبات اور وغیرہ--- وغیرہ--- وغیرہ--

"امین نے جو فہرست بنائی تھی وہ خوراک مجھے ناکافی لگتی تھی--" شاید یہ میری خوش خوراکی پر طنز تھا "اس لئے میں نے ہر آئٹم دوگنی خریدی ہے"

"ویل ڈن شاہد صاحب!"

شاہد ڈرامے کے اختتام پر تماشائیوں سے داد وصول کرنے والے ایک اداکار کی طرح جھک کر کورنش بجالایا "تھینک یو مائی لیڈر" اور گرتے گرتے بچا کیونکہ وہ بہت تھکا ہوا تھا-

کمرے کے کونے میں ایک مستطیل میز کے نیچے سے ایک ساکت سلیپنگ بیگ میں سے میاں صاحب کا مختصر سر برآمد ہوا--- انھوں نے آس پاس ٹٹولا اور اس ٹٹولنے پر برابر میں لیٹے ہوئے نوید پر ہاتھ پڑا تو وہ بڑبڑایا "میاں صاحب، ہوش کریں" اور میاں صاحب نے فوراً اُسے ایک دھپ رسید کی "اوئے میں اپنی عینک تلاش کر رہا ہوں"

"وہ میز پر رکھی ہے"

میاں صاحب نے عینک اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں پر فٹ کی اور شاہد کو فوکس میں لے کر بولے "کڑھائی لائے ہو؟"

"آپ نے سوختر آباد جا کر وہاں پکوڑے تلنے ہیں؟" شاہد ذرا تلخی سے بولا-

"نہیں تو نہ سہی--" میاں صاحب نے عینک اُتار کر میز پر پٹخی اور پھر بیگ میں روپوش ہو گئے-

"میاں صاحب---" میں نے اُن کے بیگ کو تھپکا "ناراض کیوں ہوتے ہیں-- کڑھائی بھی خرید لیں گے-- لیکن اس کا مصرف کیا ہو گا؟"

وہ پھر کچھوے کی طرح سری نکال کر باہر جھانکنے لگے "جناب عالی اُن علاقوں میں مارخور بہت ملتا ہے- ایک آدھ پکڑیں گے اور اُس کا کڑھائی گوشت بنا کر آپ کو کھلائیں گے-- یاد کرو گے"

"ہاں مارخور پامیر کی بلندی سے نیچے آئے گا-- اور میاں صاحب کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا کہ میاں صاحب جلدی سے عینک پہن کر میری شکل دیکھو اور میرا کڑھائی گوشت اس لئے بنالو کہ میں آپ کی شکل نہیں دیکھ سکتا" شاہد پھر بولا-

"ایک نہیں تین مارخور آئیں گے---" میاں صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے "باقی دو تمہارا ہیٹ اور عینک دیکھیں گے اور خودکشی کر لیں گے-"

"دیکھیں میاں صاحب-- آپ کا آئیڈیا تو بُرا نہیں لیکن میں جنگلی حیات کی بقاء پر یقین رکھتا ہوں-"

"مجھ پر کون یقین رکھتا ہے---" بقاء جو بہت دیر سے ہمیں دیکھے جا رہا تھا یکدم ہوشیار ہو کر بولا "اور کون کہتا ہے میں اونچا سنتا ہوں؟ میں نے سب سُن لیا ہے- آپ مجھے پہاڑوں میں لے جا کر میرا کڑھائی گوشت بنانے کے منصوبے بنا رہے ہیں"

"اوئے تو سو جا---" خالد نے اُسے ڈانٹا "تیرا کڑھائی گوشت کیسے بن سکتا ہے تُو تو جائز ہی نہیں---"

"سوچ لیں---" میاں صاحب نے کہا-

"نہیں میاں صاحب ہم تو قدرت کی حیرت ناکیوں کے مظاہر دیکھنے جا رہے ہیں اُن کا شکار کرنے نہیں--- یہ نہیں ہو سکتا"

"نہیں تو نہ سہی-- پر وقت آئے گا جب تم لوگ میرے ترلے کرو گے" انہوں نے سلیپنگ بیگ پھر سے اوڑھ لیا-

اور واقعی ایسا وقت آیا-- لیکن اُس کی روئداد بعد میں-

"مجھے کہتے ہیں میں ایک کان سے بولا ہوں" بقاء نے ایک اور قہقہہ لگا کر میز پر رکھے گلاس کے پانی کو لرزا دیا "اور کتنی دیر سے دروازے پر دستک ہو رہی ہے اور کوئی بھی نہیں سُن رہا"

اور واقعی دروازے پر دستک ہو رہی تھی-

"میں کھولتا ہوں---" نوید ایک سپرنگ کی طرح سیدھا ہوا "شائد کم اونیل ہو، ہمیں کوئی راستہ دکھانے آئی ہو"

دروازہ کھُلا تو قادر اور امین سر جھکائے کھڑے تھے۔ "آجائیں" نوید نے منہ بنا کر کہا۔

"نارڈ صاحب ہم نے آپ کے ٹریک کے لئے سارا سامان تیار کر دیا ہے--- آئل سٹوو، ترپالیں، کچن ٹینٹ، رسّے وغیرہ اور تین جیپیں آپ کو اشکومن تک لے جانے کے لئے--- آپ کتنے بجے روانگی پسند کریں گے؟

جفاہ ایک اور قہقہے کے لئے پر تولنے لگا تو خالد نے اُسے بڑی طرح گھورا اور اس نے پر سمیٹ لئے۔

"صبح سویرے-- تقریباً پانچ بجے ہم اشکومن کے لئے روانہ ہو جانا چاہیں گے---"

"کیا نام ہے اشکومن---" نوید ذرا اداس ہوگیا "لگتا ہے عشق کی وادی ہے---"

"عشق کی نہیں بچے---" میاں صاحب پھر نمودار ہوگئے" اشک کی وادی ہے--- عشق اور اشک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں-- تم نے کبھی عشق کیا ہو تو تمہیں پتہ ہو---"

"میاں صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اب آپ سے کیا عرض کروں---"

"نہ نہ بزرگ ہوں گے تمہارے لگتے لانے--- خبردار جو مجھے بزرگ کہا تو--- میں ٹیم ممبر ہوں سمجھے؟" میاں صاحب اپنے بیگ میں غڑاپ ہوئے اور پھر نہیں بولے۔

"تم نہیں بولتے خالد ندیم؟"

"تو میں نے عشق کا نام لیا تو لاہور میں میری بیوی کو غش آجائے گا"

"ویسے مائی لیڈر---" شاہد نے ایک کھنگورا مار کر مجھے متوجہ کیا "اسکولے بھی تو ایک اشک تھا جس کی یاد ہماری آنکھوں کو تر رکھتی ہے--- اور یہاں بھی اشکومن سے پرے ویرانے ہمارے منتظر ہیں--- میاں صاحب نے ٹھیک کہا ہے، عشق اور اشک ایک ہی چیز ہیں اور ہم سب اس میں مبتلا ہیں"

قادر نے ہم سب کی جانب ایک نہایت پُرتشویش انداز میں دیکھا--- اس سے پیشتر شاید اس نے ہم جیسے گھومے ہوئے کوہ نورد نہیں دیکھے تھے "میں صبح سویرے سامان پیک کر کے جیپوں کے ساتھ چتراران کے باہر پہنچ جاؤں گا۔ آپ اپنی تیاری مکمل رکھئے" یہ

کہہ کر اس نے امین کے کھُلے منہ کی طرف دیکھا اور وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

تو پھر سفر کی شب اداسی کی تہوں میں سے کیا نکلتا ہے--

شائد عشق اور اشک---

اشکومن

"تین جیپیں---- عشق اور اشک اور اشکومن"

تین جیپیں--- دریائے گلگت کے اوپر--- جو ابھی دھوپ چھاؤں میں تھا--- ڈِنکی کاروں کی طرح بل کھاتی دھول اُڑاتی چلی جا رہی تھیں۔

تریوی فوارے میں پڑے سِکّوں کی طرح ان تینوں جیپوں میں بھی خواہشیں تھیں۔

یہ خواہشیں وادیٔ اشکومن کو جا رہی تھیں۔

چٹانوں میں کھدا یہ راستہ دریا کے ہوائی منظر کے کنارے پر تھا اور نازوں تلے آنے والا ہر کنکر سوئمنگ پول کے تختے پر سے چھلانگ لگانے والے تیراک کی طرح اُچھل کر فضا میں بلند ہوتا اور پھر دیر تک ہوا میں رہنے کے بعد پانی میں گم ہو جاتا۔

ایک موڑ پر ایک سُرخ جھنڈی پھڑپھڑا رہی تھی۔

شمال کا ایک مشہور گائیڈ جسے میں ترشنگ میں مل چکا تھا اپنی جیپ میں دو سو سیاحوں کو پہاڑوں سے واپس لا رہا تھا اور یہاں سے نیچے گیا تھا--- صرف دو روز پیشتر۔

کسی نے کہا تھا کہ شیر چاہے کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو خصلت میں شیر ہی رہتا ہے--- کچھ اسی طور شمال کے راستے چاہے کتنے ہی محفوظ کیوں نہ ہوں ان کی خصلت تبدیل نہیں ہوتی اور انسانی خون کے بغیر ان کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔

کہیں آگے چل کر--- کسی اور موڑ پر--- یہ سرخ جھنڈی ان تینوں جیپوں میں سے کسی ایک کی یاد میں بھی پھڑپھڑا سکتی تھی--- موت کا خوف دل سے جاتا تو نہیں لیکن اس کی مسلسل قربت بندے کو تھوڑا سا ڈھیٹ ضرور کر دیتی ہے اور کچھ لوگ اسے بہادری کا نام دیتے ہیں۔ یوں بھی جان اتنی پیاری ہو تو بندہ ان علاقوں میں خاص طور پر پہنچ کر چلّے کیوں لے--- اُدھر مری کی مال روڈ پر سوٹ پہن کر سرکس پریڈ میں کیوں شامل نہ ہو---

آہستہ آہستہ سفر کا منظر صاف ہو رہا تھا--- اس منظر کے راستے اور منزلیں واضح ہو رہی تھیں۔ راشت سے ذرا آگے برسک نالے تک ہم جیپوں میں جا رہے تھے--- اور وہاں نالہ عبور کرنے کے بعد ہمارے پیدل سفر کا آغاز ہو جائے گا۔ تین دن کی مسافت کے بعد ہم چھوٹے پامیر کے دامن میں سوخر آباد کی وادی میں داخل ہوں گے۔ درّہ چیلنجی کے پہلو میں سے گزرتے ہوئے--- اس راستے میں کرومبر اور سوخر آباد گلیشیئر بھی آئیں گے۔ وادیٔ سوخر آباد کے بعد وہ ہولناک گلیشیئر چتی بوئی حائل ہوتا تھا جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور اگر کچھ شنید تھی تو یہی تھی کہ یہ گلیشیئر کوہ نوردوں کے قدموں سے سخت الرجک ہے اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے اس کے پاس برفانی دراڑوں کے بے شمار تحائف ہیں۔ چتی بوئی کے پار وادیٔ سوئچ تھی جس کے اختتام پر وہ جھیل تھی جسے دیکھنے اور جس کے کناروں پر خیمہ زن ہونے کے لئے--- ان جیپوں میں سوار خواہشیں دربدر ہو رہی تھیں۔ جھیل کرومبر سے پرے دنیا کی خوبصورت ترین وادیوں میں سے ایک بروغل--- تھی۔ جس کی برفانی اور سرد ڈھلوانوں پر یاکوں کے ریوڑ منفی درجہ حرارت کی یاک سرائے میں رہتے تھے--- بروغل کے بعد واخان کی پٹی کے پہلو بہ پہلو متعدد وادیوں میں سے سفر کرتے ہمیں پکار پہنچنا تھا اور وہاں سے درّہ درکوت عبور کر کے چترال سے ایک مرتبہ پھر گلگت کے علاقے میں اترنا تھا--- روات درکوت گاؤں کے نواح میں--- اور وہاں سے اگر جیپوں کا بندوبست ہو جائے تو اُن پر واپس گلگت--- لیکن ابھی جام اور لبوں کے درمیان بہت فاصلے تھے، بہت دراڑیں اور بلندیاں تھیں۔

اس ٹریک پر اکا دکا پاکستانی گئے تو ہوں گے لیکن ایک مہم کی صورت میں کوہ نوردوں کا یہ پہلا قافلہ تھا جو اُن وادیوں میں اترنے کو تھا۔

سنگل میں ناشتے کے لئے تینوں جیپوں کے بریکیں لگیں۔

چائے خانے کا مالک آنکھیں ملتا ہوا آیا اور اتنے ڈھیر سارے گاہک دیکھ کر فوراً ہوشیار اور دوست ہو گیا "آیئے صاحب--- کیا بنائیں؟ پراٹھا بنائیں؟--- انڈہ بنائیں--- چائے بنائیں"

"پراٹھے کے علاوہ بھی کچھ ہے؟" خالد ندیم نے اپنے جگری تولیے سے اپنے چہرے پر جمی گرد پونچھی۔

"ہاں صاحب---"

"اور کیا ہے؟"

"اور پراٹھا---"

"اوئے خالد ندیم تیری ان حرکتوں کی وجہ سے ہم نے تجھے تمغل سے واپس کر دیا تھا--- تجھے اور کیا چاہئے--- مکھن توسٹ چاہئے--- کارن فلیکس چاہئے--- اطالوی کافی چاہئے--- پراٹھا ہضم نہیں ہوتا تجھے؟" میاں صاحب ہماری مہم کے دہشت گرد تھے اور سبھی اُن سے ڈرتے تھے چنانچہ خالد ندیم بھی فوراً بیک آؤٹ کر گیا "سوری میاں صاحب--- دراصل مجھے انڈہ توسٹ کھانے کی عادت ہے ناں---"

"اور مجھے ناشتے پر سری پائے کھانے کی عادت ہے" میاں صاحب چہکے "اوئے عادتوں کو بھول جاؤ--- بیویوں کو بھول جاؤ"

"میں کس کو بھول جاؤں---" نوید نے ہاتھ بلند کر کے فریاد کی۔

"تم اپنی منگیتر کو بھول جاؤ بچے--- تم وادی اشکومن کی طرف جا رہے ہو وادی عشق من کی طرف نہیں جا رہے---"

مخدوش تیل میں پوریوں کی طرح تلے ہوئے کڑکڑاتے پراٹھے ازحد لذیذ تھے اور چائے کی شیرینی ہونٹوں کو چپکاتی تھی۔

خالد ملتانی پراٹھا نوش کرتے ہوئے صرف ایک ہاتھ کو استعمال میں لا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹے کو تھام رکھا تھا--- اور اپنے آپ میں مگن مسکراتا تھا۔ کیوں مسکراتا تھا اس کا بھید بہت بعد میں جا کر کھلا--- اس نے بقاء کی طرف دیکھا جو تیسرے پراٹھے کی جانب نہایت رغبت سے دیکھ رہا تھا "فوٹو کھچ اوئے---" خالد نے بقاء کو حکم دیا اور بقاء نے فوراً کیمرہ نکالا خالد کی طرف لینز کا رُخ کیا اور بٹن دبا دیا--- خالد ملتانی کی یہ عادت پورے ٹریک میں ہمارے ساتھ سفر کرتی رہی--- اُسے تصویر کھنچوانے کا شوق نہیں تھا بلکہ شوق تھا جو شوق سے بہت آگے کی چیز ہوتی ہے۔ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد کسی پرخطر گھاٹی کے کنارے پوز بناتے ہوئے، کسی تیز نالے کے درمیان بمشکل بیلنس قائم رکھتے ہوئے، کسی آبشار میں بھیگتے ہوئے وہ یک لخت ساکت ہو جاتا "فوٹو کھچ اوئے---" اور بقاء ایک بے دام غلام کی طرح کیمرہ اس کے رُوبرو کرتا اور تصویر کھینچ لیتا--- اس کے منظر سے ہٹتے ہی منظر زیادہ خوبصورت ہو جاتا۔

ناشتے کے بعد جیپیں دوبارہ چلیں تو اُن کے جبڑوں سے ڈھول کم اٹھتی تھی۔ وہ سست رفتار ہو چکی تھیں کیونکہ اُن کے ڈرائیور حضرات نے اپنے پلّے سے نہیں مہم کے پلّے سے بے دریغ انڈے پراٹھے نوش کئے تھے---

اس سڑک پر یہ میرا پہلا سفر نہیں تھا-- کچھ برس پہلے میں اپنے خاندان کے ہمراہ دو جیپوں پر اسی راستے پر گوپس اور وادی پھنڈر سے گزر کر درہ شندور کے پار چترال میں

اُترا تھا--- کیلاش کی وادی میں چند یادگار دن اور کافروں کے ڈھولوں کی تھاپ میں چند رقص آمیز راتیں گزری تھیں--- لیکن یہ ایک الگ قصہ ہے جو میں ابھی سنا نہیں سکا---

دریائے گلگت کا پاٹ وسیع ہو رہا تھا اور اس کے پھیلے ہوئے بہاؤ میں جابجا ریتلے جزیرے تھے جن میں بنفشی رنگ کے لمبے لمبے بٹے تھے اور پہاڑ دور ہوتے ہوئے سویر کی ہلکی دُھند میں گم ہو رہے تھے--- بلکہ اب یہ دریائے غذر تھا۔ یہیں سے ایک نئے نکور جاپانی پُل کی معلق کمانوں کی طرف ہماری جیپیں اُتریں، گوپس روڈ کو خیرباد کہا اور ہم دریا کے پار اُتر کر اُن پہاڑوں کی جانب اُترنے لگے جو سویر کی ہلکی دُھند میں ابھی روپوش تھے اور ابھی ظاہر ہو کر اپنے برفانی حُسن کی داد طلب کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ وادی اشکومن کا آغاز تھا اور ہمارے جوڑوں اور پسلیوں کی آزمائش کا آغاز تھا کہ جیپوں میں بے اختیار ہوتے ہمارے بدن رقص کرتے تھے--- ایسا رقص جو سفر کی زنجیر پہن کر ہی کیا جاتا ہے۔

جگہ جگہ اگرچہ باغ بہاراں تھے لیکن ہم جان نہیں سکتے تھے کہ درختوں پر کونسے پھل ہیں کہ ہماری مسلسل سے رقص کیفیت میں جو تھرتھراہٹ تھی اس میں نظر ایک جگہ ٹکتی نہیں تھی اور باغات اور اُن کے پھل آؤٹ آف فوکس لرزتے ہوئے گذر جاتے تھے۔

دریا جو پہلو میں تھا--- اگرچہ پہلو سے ذرا فاصلے پر تھا اور ہم اس کے شکرگزار تھے کہ وہ کہیں گہری کھائی میں سڑک کے عین نیچے نہ تھا--- دریائے اشکومن ہو چکا تھا۔

عشق اور اشک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور اشکومن-- گلگت سے تقریباً اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر وادی نلتر اور وادی یاسین کے درمیان میں واقع ہے--- یہ تینوں وادیاں اپنی اپنی کوہستانی وادیوں میں گھری ہوئی ہیں اور الگ الگ ہیں۔ اشکومن کے پانچ بڑے گاؤں ہیں جو دریا کے آر پار واقع ہیں۔ چٹور کھنڈ، پکورہ، دائین، ایمت اور اشکومن--- دو بلند چوٹیاں اس کی شناخت ہیں-- کوگوہ جو ۵۱۳۰ میٹر بلند ہے اور ہنگل جس کی بلندی ۵۳۲۳ بتائی جاتی ہے۔ تین معروف نالوں متمتز، تس اور ہنگل کے آس پاس جو گھنے جنگل ہیں اُن میں گھاس بکثرت ہے اور شنید ہے کیونکہ ہم نے تو نہیں دیکھے کہ وہاں مارخور، بھیڑیے، لومڑیاں، چکور اور باز وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

مقامی آبادی ان دنوں متوقع ازبکستان روڈ کے خواب میں مبتلا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ وسط ایشیاء تک کے زمینی راستے کے لئے وادی اشکومن بھی زیرِ غور ہے۔ ہم جہاں بھی

گئے۔۔۔ کسانوں نے، پورٹرز نے، چرواہوں نے ہم سے یہی درخواست کی کہ صاحب۔۔۔ اوپر جاکر کسی کو بولو کہ ازبکستان روڈ ادھر سے لے جاؤ، ہمارا بہت بھلا ہوگا۔ ہم خوشحال ہو جائے گا۔۔۔ بعد میں صدرِ پاکستان سے ایک ملاقات کے دوران میں نے مقامی آبادی کی یہ خواہش اُن تک پہنچا دی تھی اب اُن کے نصیب۔۔۔

گلگت میں ایک اشکومنی نوجوان راجہ جہاں زیب میرے پاس آیا اور کہنے لگا تارڑ صاحب۔۔۔ میں آپ کو اپنی وادی کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرسکتا ہوں جو آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملیں گی۔۔۔ فراہم کرودں! اس نے فراہم کر دیں اور وہ بہت دلچسپ اور ثقافتی قدروں کے حوالے سے انتہائی اہم ہیں۔۔ جہاں زیب کا کہنا تھا کہ وادیٔ اشکومن میں پانچ بڑے تہوار ہیں۔

پی تہوار جو ہر برس یکم مارچ کو منایا جاتا ہے۔۔۔

یہ تہوار فوراً میرا پسندیدہ ہوگیا کیونکہ میں اسی تاریخ کو اس جہانِ فانی کی سٹیج پر عارضی طور پر نمودار ہوا تھا۔۔۔ شینا زبان میں "پی" سے مراد پنجابی کی طرح "بیج" ہے۔ یکم مارچ کو وادی کے لوگ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں اور بیج بونے اور پودے لگانے کا آغاز کرتے ہیں۔ گھروں کی دیواروں پر گندم کے آٹے سے دیدہ زیب پھول بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ شام کو "رسم بیباس" ادا کی جاتی ہے۔۔۔ گھر کے صحن میں الاؤ روشن کرکے آگ میں آٹا پھینکا جاتا ہے۔۔۔ زمین کی زرخیزی کے لئے اور خوراک کی فراوانی کے لئے۔۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے قدیم تہذیبوں کا محقق ہونا ضروری نہیں کہ یہ تہوار اُن زمانوں کی یادگار ہے جب انسان فطرت کی قربت میں تھا، زمین اور خوراک اس کی زندگی میں اہم ترین ضرورتیں تھیں اور وہ ابھی مذہب کے اصولوں کے تابع نہیں ہوا تھا۔

دوسرا تہوار "میتسوکوٹ" ہر برس یکم جولائی کو منایا جاتا ہے۔

سورج غروب ہونے سے پیشتر لوگ کھیتوں میں سے گندم کی بالیاں کاٹ کر لاتے ہیں اور گھر کی بیرونی دیوار پر لٹکا دیتے ہیں۔۔۔ انسان کے ابنِ آدم ہونے کے ثبوت پوری دنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک عجیب پراسرار اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ انسان کسی بھی رنگ کا ہو کسی بھی نسل یا ملک کا ہو کہیں نہ کہیں اس کی ثقافتی رسوم ایک ہو جاتی ہیں۔۔۔ سرفریزر کی شہرہ آفاق کتاب "دے گولڈن باؤ" جس کا ترجمہ "شاخِ زریں" کے نام سے شائع ہوچکا ہے ایک ایسی تحقیق ہے جو اس تجسس کو ثابت کرتی ہے کہ کہیں ازمنہ قدیم میں انسان ایک تھا اور پھر اس کی نسل بتدریج بڑھی اور دنیا بھر میں پھیل گئی۔

بہت عرصہ پہلے جب میں نے ایک دوست کے کہنے پر اس کتاب کی پانچ جلدوں کو انتہائی عرق ریزی اور بوریت سے مسلسل پانچ ماہ تک پڑھا تو عجیب و غریب انکشافات ہوئے۔۔۔ اگر جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں ایک چھوٹا سا قبیلہ لوہے کے ٹیبو پر یقین رکھتا ہے اور وہاں بچے کی پیدائش کے وقت حاملہ عورت کے سرہانے لوہے کی بنی ہوئی کوئی شے اس یقین کے ساتھ رکھی جاتی ہے کہ اس کے اثر سے بچے کی پیدائش میں آسانی ہوتی ہے تو مجھے۔۔۔ پنجاب کے ایک گاؤں کی اگرچہ انتہائی تہذیب یافتہ لیکن ان پڑھ خاتون میری نانی جان بتایا کرتی تھیں کہ جب تمہاری پیدائش کا وقت قریب آیا تو میں نے تمہاری ماں کے سرہانے ایک تالہ رکھا تھا کہ۔۔۔ اُسے آسانی ہو جائے۔ افریقہ کے ایک گھنے اور سیاہ علاقے میں بارش نہیں ہوتی تھی تو بچے بزرگوں پر پانی پھینک کر انہیں اشتعال دلاتے تھے اور بارش ہو جاتی تھی۔۔۔ ہمارے دیہات میں آج بھی بارش نہ ہونے پر بابا لوگوں پر پانی پھینک کر ان کی گالیاں سنی جاتی ہیں۔ کالیاں اِٹاں کالے روڑ۔۔۔ مینہ وسا دے زور زور۔۔۔ اور اگر دنیا کے کسی دور افتادہ علاقے میں بچے کی پیدائش پر کسی مقامی درخت کی شاخیں کاٹ کر گھر کی چوکھٹ سے لٹکائی جاتی ہیں تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ اس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے تو ہمارے دیہات میں بھی اس موقع پر چوکھٹ سے شریہنہ کے پتے لٹکائے جاتے ہیں۔

اور یہاں اشکومن میں گندم کی بالیاں لٹکائی جاتی ہیں۔

رسوم اور ثقافت کی یہ یک جہتی صرف اسلئے ہے کہ نسلِ انسانی کا آغاز ایک تھا۔۔۔ مختلف نسلوں، قبیلوں اور خطوں میں منتشر ہونے کے بعد بھی اُن کی آبائی اور قدیم حس مشترکہ ہے۔ چنانچہ اشکومن ایک مختصر اور غیر معروف وادی ہی سہی۔۔۔ لیکن نسلِ انسانی کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔

۲۰ جون کو "تیلٹ بوجوک" یعنی نالے کی طرف جانے کی رسم کا تہوار منایا جاتا ہے۔

صبح سویرے لوگ اپنے مال مویشی اور خوراک کے ساتھ اُن نالوں کے ساتھ ساتھ بلند چراگاہوں کی جانب جاتے ہیں جہاں وہ اور اُن کے عزیز رشتے دار عارضی طور پر آباد ہوتے ہیں۔

اور ۲۰ ستمبر کے آس پاس چونکہ موسم سرما کی شدت کا آغاز ہوتا ہے اس لئے لوگ نالوں سے اُتر کر گاؤں واپس آجاتے ہیں۔ اس تہوار کو "نیلو داہوگ" کا نام دیا جاتا ہے۔ جو لوگ نالوں سے نیچے آتے ہیں وہ گاؤں کے گھروں میں جاکر دُودھ اور مکھن کے

تحفے پیش کرتے ہیں۔

آخری تہوار "ناسالو" نام کا ہے۔

موسم سرما کی سختیوں اور خوراک کی قلت کے پیش نظر یکم نومبر کو ہر گھر میں ایک دو جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور اُن کا گوشت برفباری کے دنوں کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ وادئی اشکومن میں اُس روز تقریباً چار ہزار جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔

تین جیپیں تریوی فواترے میں پڑے سکتے--- خواہشوں میں گم وادئی اشکومن میں چلی جا رہی تھیں۔ دریا کے پار وادئی حاتون کے بتدریج بلند ہوتے سرسبز کھیت نظر آتے تھے۔

گلو داس کے قصبے میں سڑک کے دونوں طرف بلند پتھریلی دیواروں میں پھنسی ہوئی جیپیں ذرا سست ہونے لگیں تو ہم نے چوکھٹوں اور بے کواڑ کھڑکیوں میں ایسے چہرے دیکھے جن کے عشق میں کسی نہ کسی نے اشک ضرور بہائے ہوں گے--

گل فشاں، زرفشاں، آتشی رنگوں کے چہرے۔

دائیں جانب وادئی ملتر کو ہماری نظروں سے اوجھل کرنے والی چوٹیوں کی سفیدی آسمان کی نیلاہٹ سے الگ ہو کر نیچے ہماری تین جیپوں تک آتی تھی اور اُن سے جنم لینے والے نالے کہیں نہ کہیں ان کے ناڑوں کی زد میں آ کر ہمیں بھگو دیتے تھے۔

چٹور کھنڈ ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک تناور چنار کے سائے میں کچھ لوگ قریب رُکی تین جیپوں سے بظاہر بے خبر لڈو کھیلنے میں مگن تھے۔ چنار کے سامنے شمالی علاقوں کی ایک مخصوص دکان تھی--- جس کی دیواریں بسکٹوں کے خالی ڈبوں سے سجی تھیں۔ لڈو کھیلنے میں مصروف حضرات نے ہمیں زیادہ عزت افزائی کے لائق نہ سمجھا اور ہم پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اپنی گوٹیوں پر جھک گئے۔ سنگل کا ناشتہ--- کرارے پراٹھوں کا ناشتہ راستے کی اتھل پتھل اور دھاچوکڑی کی وجہ سے کب کا ہضم ہو چکا تھا اور ہمارے معدے وقتِ افطار سے پانچ منٹ قبل کے روزہ دار کی طرح دوہائی دے رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ چٹور کھنڈ ایک بہت بڑا گاؤں ہے اور وہاں ہوٹل ہیں اور دنیا جہان کی خوراک ملتی ہے۔

ہم اس دنیا جہان کی خوراک کے اشتیاق میں یہاں رُکے تھے۔

"کچھ کھانے کو ملے گا؟" ہم نے دکانِ واحد کے دوکاندار سے پوچھا۔

"بسکٹ ملے گا اور---" اُس نے خالی ڈبوں میں پوشیدہ ایک فلاسک برآمد کی "اس میں میری بیوی نے چائے بنایا ہے۔ چائے ملے گا لیکن صرف تین کپ---"

"تارڑ صاحب--- میرا ایک مشورہ ہے" میاں صاحب قریب آگئے "یہ جو ہمارے ساتھ کک ہے امین--- میں باورچی نہیں کہہ رہا کیونکہ یہ مائنڈ کر جاتے ہیں احترام سے کک کہہ رہا ہوں تو اسے کہیں یہاں چولہا گرم کرے اور کچھ روٹی پانی کا بندوبست کرے نہیں تو ٹیم فوتیدگی کے قریب ہے---"

"ہمیں ابھی اشت پہنچنا ہے میاں صاحب--- ذرا صبر کر لیں"

"کر لیتے ہیں---" میاں صاحب فوراً مان گئے "چلو بھئی ڈرائیور صاحبان اشت چلتے ہیں"

چٹور کھنڈ سے نکلتے ہی ہم نے ایک معلق پل عبور کیا اور ظاہر ہے یہ پل ایک دریا پر تھا اور دریا اشکومن تھا--- ہر پل کو دیکھ کر مجھے ایک سیانے کا مقولہ یاد آتا ہے کہ نسلِ انسانی میں واحد مثبت عمل پل بنانا ہے۔ کیونکہ اسے عبور کر کے انسان دوسرے انسانوں تک پہنچتا ہے--- اس عمل کے سوا انسان کے ہر عمل میں بدی اور برائی کا پہلو تلاش کیا جا سکتا ہے۔

باری باری جیپیں رُکتی گئیں۔

سڑک کے آرپار ایک تناور درخت بڑی شانتی سے لیٹا ہوا تھا اور جیپیں اُسے پھلانگ کر دوسری طرف جانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھیں۔

میں نے فوری طور پر گرد و نواح پر ایک جاسوسی نظر ڈالی-- یہ جاسوسی نظر اُن موقعوں پر دوڑائی جاتی ہے جب کسی مسافت کے دوران یکدم راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسی رکاوٹ سامنے آ جاتی ہے جسے عبور کرنا اس لمحے ممکن دکھائی نہیں دیتا-- کوئی نالہ مسافت کے راستے میں حائل ہو کر پُرشور احتجاج کرنے لگتا ہے کہ میں تمہیں پار نہیں جانے دوں گا تم کچے گھڑے پر چناب پار کر سکتے ہو لیکن مجھے پار نہیں کر سکتے--- کوئی لینڈ سلائڈ--- کوئی بڑا پتھر-- اور تب یہ جاسوسی نظر دوڑائی جاتی ہے کہ اگر یہیں پر شام ہو جائے تو کیا رات بسر کرنے کے لئے آس پاس کوئی مناسب مقام ہے--- اور میں نے دیکھا کہ خوبانی اور سیبوں کے ایک باغ میں گھاس سرسبز ہے اور درمیان میں شفاف پانی بہتا ہے--- اور میں لاپرواہ ہو گیا اور اُس درخت کی رکاوٹ کو فی الفور ذہن سے رخصت کر دیا۔

لیکن تین جیپوں کے تین ڈرائیور اگر کلہاڑیاں لے کر جو کہ اُن کی ایمرجنسی کٹ میں موجود تھیں۔ اکلوتے درخت پر پل پڑیں چاہے وہ کتنا ہی زور آور اور تناور کیوں نہ ہو--- تو وہ اُسے تیس منٹ کے اندر اندر کاٹ کر راستہ صاف کر سکتے ہیں--- اور انہوں

نے ایسا ہی کیا۔

کچھ دیر بعد ہم نے پکورہ نالہ عبور کیا جو وادی ملتر سے اُتر رہا تھا۔

برف سے ڈھکی ہوئی کوہ اشکومن شمال کی جانب دکھائی دے رہی تھی۔

ایک عجیب نام کا گاؤں راستے میں آیا--- گنگلش--- دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور جہاں کھیت تھے اُن میں سربلند مکئی کے ٹانڈے تھے یا گندم کی ہنوز کچی بالیاں تھیں۔

دھوپ میں تمازت شدید تھی اور دور نظر آتی برف کی ٹھنڈک ہم تک نہ پہنچتی تھی۔

پھر امت آگیا--- جو ایک زمانے میں وادی کا صدر مقام تھا۔

سڑک کے کنارے ٹیلی فون ایکسچینج کی سادہ سپاٹ اور بیرک نما عمارت تھی--

اور اُس کے اندر ایک درخت تھا۔

اُس کے اندر صحن میں زرد سورج خوبانیوں کا ایک درخت تھا جو جانے کب ایک گٹھلی سے پھوٹ؟ پودا بنا اور پھر اُس کی شاخیں وجود میں آئیں اور برسوں بعد ان پر پھل لگا تو اُس نے شاید کسی پیر فقیر سے وعدہ کر لیا کہ میں میدانوں سے آنے والے ان آوارہ گردوں کا منتظر رہوں گا اور اپنی مٹھاس سنبھال رکھوں گا اور اپنے زرد تحفوں سے ان کا استقبال کروں گا ان آوارہ گردوں کا جو اس وادی میں کبھی نہ کبھی آئیں گے اور باہر سے گذرتی سڑک پر سے دوسرے سیاحوں کی طرح گذر نہیں جائیں گے بلکہ ایک سالخوردہ دروازے کو کھول کر صرف میرے لئے اس صحن میں، برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر لیٹ کر اپنی تھکاوٹ دور کریں گے--- میں اُن کا منتظر رہوں گا---

ٹیلی فون آپریٹر پنجاب کے کسی گاؤں کی اداسی میں جلا اور بیمار جب ہمیں دیکھتے ہیں تو کھل جاتے ہیں۔ خوبانیوں سے لبریز ایک تھال جس کے کناروں کو خوبانی کی شاخوں اور پتوں سے سجایا گیا تھا ہمارے سامنے رکھا گیا۔ اچھی خوبانی کی خوبی یہ ہے کہ وہ پچھلی بار کھائی ہوئی خوبانی کے رس بھرے ذائقے کو بھلا دیتی ہے اور نزدیک سے گذرتے کسی خوباں کو چھیڑنے پر اُکساتی ہے---

شکر کی خوبانیاں میری پسندیدہ ہیں لیکن امت کی یہ خوبانیاں چیزے دیگر تھیں۔

برآمدوں میں جو چارپائیاں بچھی تھیں ہم ان پر آہستہ آہستہ لیٹتے گئے بلکہ لم لیٹتے گئے اور ایک ایسی آلکس اور غنودگی طاری ہونے لگی جو بڑے بڑے مہم جُو کی بیڑیوں میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر اُٹھنے کا نام نہیں لیتی--- اور ہم تو مہم جُو نہ تھے--- جان بُوجھ کر گم ہو جانے والے مسافر تھے۔

تھال میں اب اکا دکا خوبانیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"خالد ملتانی یار ایک اور ہو جائے---"

"نہیں جناب--- میں تقریباً بیس پیگ نوش کر چکا ہوں، اکیسویں کی گنجائش نہیں" اُس کی آنکھوں میں خمار کا بخار تھا" فوٹو کھیچ اوئے---" اُس نے بقاء کو پکارا---

بقاء پہلے کب سنتا تھا جو اب خوبانی بخار میں جلا سنتا---

ٹیلی فون آپریٹر کی بورڈ کو مسلسل اپنی انگلیوں سے زدوکوب کر رہا تھا کہ اُس کا رابطہ گلگت سے ہو جائے لیکن چتور کھنڈ کے قریب کوئی لائن تھی جو کسی نالے میں گر کر ٹھنڈی ہو چکی تھی--- اُس کی خواہش تھی کہ مہمان نوازی کے طور پر ہم امت میں بیٹھے ہوئے لاہور اور ملتان اپنے گھر والوں سے بات کر سکیں۔ ہم سب خواہش مند تھے کہ وادی اشکومن کے اس خوبانیوں کے خمار میں اپنے گھروں میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی کو حرکت دیں اور--- ممی میں للو بول رہا ہوں--- کہاں سے للو؟--- اِمت سے--- وہ کہاں ہے للو؟--- لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ گلگت سے رابطہ بحال نہ ہو سکا۔

اسی خمار آلود کیفیت میں عبدالاحد کی آمد ہوئی--

"آپ ذرا تاخیر سے آئے ہیں۔ شام سے پہلے ہمیں ایک دو نالے عبور کرنے ہیں-- پورٹرز کا بندوبست ہو چکا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق نالہ برسک میں طغیانی ہے اور جیپیں اُن کے پار نہیں جا سکیں گی--- اس لئے اب دیر نہ کیجئے---"

خوبانی

"خوبانی کے خمار میں---- اشکومن کی رات میں"

ہم خوبانی کے اس خمار سے باہر آئے پھر اِشت کی آبادی سے باہر آئے تو سورج وادی یاسین میں اُترنے کو تھا اور ہوا میں ٹھنڈک کا تناسب یکدم بڑھ گیا۔

راستے پر جابجا پتھر اور سنگ دل دلدل سخت ہوتی تھی اور اُس پر جیپیں وقت سے چلتی تھیں۔ دھوپ کی زردی پر شام کی سیاہی جب گھلتی تھی تب برسک نالے کا شور ہمیں سنائی دیا--- وہاں اِدھر اُدھر پتھروں پر براجمان ہمارے پورٹر اِشت کی جانب سے قریب آتی تین جیپوں کو دیکھتے تھے جن سے اُن کا روزگار اور آنے والے موسم سرما کی خوراک وابستہ تھی۔

جیپیں ایک ایک کر کے رُکتی گئیں۔

کوئی بھی چار پہیہ شے اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ برفپوش بلندی سے برسک کا جو نالہ نیچے آ رہا تھا اُس میں مشینی اہلیت نااہل ہو جاتی تھی اور صرف انسانی قدم ہی اِسے پار کر سکتے تھے--- لیکن مقامی انسانی قدم--- ہمارے میدانی قدم بھی نااہل قرار پاتے تھے۔

سامان اتارا جانے لگا۔ پورٹرز ہمارے رُک سیک، خیمے، خورد و نوش کی اشیاء کے نیلے ڈرم اور تھیلے اٹھا اٹھا کر نالے کے پار جانے لگے۔ اُن کے بدن پانی کے زور سے تُند ہوا کی زد میں آئی ہوئی نازک ٹہنیوں کی طرح ڈولتے اور ڈگمگاتے تھے۔

"آئیں تارڑ صاحب---" احد نے مجھے سہارا دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کیا--- اور دراصل اِسی ہاتھ کے سہارے میں اِس ٹریک کی دشواریوں اور موت مقامات کو آئندہ دنوں میں عبور کر گیا۔

میں نے اس سے پیشتر کسی پہاڑی نالے کی تندی میں قدم نہیں رکھا تھا--- کے ٹو ٹریک پر چند نالے جو راستے میں آئے وہ شاید مجھ پر ترس کھا کر اُن دنوں نہ تُند تھے اور نہ

سرکش--- لیکن برسک نالے میں ایک بے لگام سرکشی تھی اور وہ بدکتا تھا۔ میں نے اپنے بوٹ اور جرابیں اُتاریں اور احد کا ہاتھ تھام کر پانی میں قدم رکھا--- اور پانی کا گرداب گویا میرے پاؤں کو گرفت میں لے کر اسے اٹھا دینے کا منتظر تھا--- تہہ کے پتھروں پر یوں بھی پاؤں پھسلتے تھے۔ اس کی ٹھنڈک نے میری ٹانگوں کو بخ کر دیا اور میرے پاؤں سُن ہو کر پانی سے باہر آنے سے انکاری ہوتے تھے--- پار پہنچ کر پورٹرز نے بے پناہ شور مچایا، چیخیں ماریں اور ایک دوسرے کی گھر والیوں کی شان میں گستاخی کر کے خوشی کا اظہار کیا--- اور میں بھی پار پہنچ ہی گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر منجمد شدہ اور بظاہر زندگی سے مفقود ٹانگوں کو مٹھی چاپی کر کے گرمانے کی کوشش کرنے لگا---

جیپیں نالے کے پار رہ گئی تھیں۔ جب ہمارا آخری ساتھی اِدھر پہنچا تو جیپوں نے متعدد بار ہارن بجا کر ہمیں الوداع کہا اور ایک ایک کر کے اِشت کی طرف منہ موڑ لیا--- جیسے تین کشتیاں ہمیں ایک اجنبی جزیرے پر اُتار کر واپس جا رہی ہوں--- میں نے جیپ ڈرائیور کو ایک غیر محتاط اندازے کے مطابق آج سے پورے گیارہ دن کے بعد درکوت گاؤں میں پہنچنے کو کہا تھا جہاں یا قسمت یا نصیب--- ہم نے اس ٹریک کے اختتام پر درہ درکوت سے اُترنا تھا--- یا نہیں اُترنا تھا۔

آگے شام کے سایوں میں ایک نامعلوم کوہستانی سلسلے میں وہ راستہ تھا جس پر اب ہمیں پیدل چلنا تھا۔

میرا بڑا رُک سیک سُرخ رنگ کا نگیر خان نامی پورٹر کے کندھوں پر مجھ سے دُور ہو رہا تھا۔ میرے پاس ایک اور چھوٹا سا رُک سیک تھا نیلے رنگ کا--- میں نے اُسے اٹھایا۔ جیسے کتورے کو کان سے پکڑ کر اٹھاتے ہیں اور وزن کا اندازہ کیا--- سٹل کیمرہ، وڈیو، فلمیں، برساتی، سویٹر، سادہ کاغذ اور مارکر بال پوائنٹ، سوئیٹس اور چند تصویریں جو تصویر بتاں تو نہ تھیں جو کہیں بلند پہاڑوں میں بعد مرنے کے مرے سامان سے نکلتیں--- وزن پانچ چھ کلو سے زیادہ نہ تھا---

میں نے رُک سیک کندھوں پر رکھا--- چار روز سے بڑھی ہوئی نصف سے زیادہ سفید داڑھی کو کھجایا۔ ایک گہرا سانس لیا۔ اللہ کا نام لیا اور سر جھکا کر--- اس کی عظمتوں اور سربلندیوں کے سامنے اپنے آپ کو حقیر جان کر اور مان کر اور پہچان کر--- چلنا شروع کر دیا۔

ٹیم کے ممبران ابھی ردھم میں نہیں آئے تھے۔ اُن کے اندر ابھی تارکول کی پکی سڑکیں، کاریں، جیپیں اور موٹر سائیکل چلتے تھے وہ ابھی خود نہیں چلتے تھے اور شتر بے مہار

کی طرح جھولتے ہوئے چلتے تھے۔ ابھی ہمارا راستہ متعین تھا۔۔۔ دونوں جانب کمر تک آتی پتھریلی حد بندی تھی، جہاں تک کسی زمانے میں جیپ آتی تھی اور جو سیلابوں اور پتھروں کے باعث بلاک ہو چکی تھی ہم اُس روڈ پر چلتے تھے۔۔ اور اب اُس راستے پر جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔

ڈھلتی شام کی سردی میں بلندی پر پائے جانے والے سیاچن والے "سیا" گلابوں کی خوشبو تیز ہوتی تھی اور خبر کرتی تھی کہ تمہارے میدان بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جب ہم جھاڑیوں میں چلتے تو چھوٹے چھوٹے پرندے حیرانگی کے عالم میں پھدکتے ہوئے اُڑتے۔ اُن میں سے ایک پرندہ زرد اور سیاہ رنگت کا تھا جو اُڈاریاں مارتا میرے آگے آگے اڑان کرتا۔۔ اور اُس نے بہت دور تک میرا ساتھ دیا۔۔ ذرا آگے جا کر ہم دائیں جانب ایک آبشار کے شرابور شور میں سے گذرے تو آگے شام کی تاریکی مزید گہری ہو گئی۔

واخان پامیر کی اس مہم میں میاں صاحب، شاہد اور خالد ندیم آزمودہ، قدیمی اور تجربہ کار نسخے تھے۔ انہوں نے کے۔ٹو ٹریک میں اپنی ثابت قدمی سے میرے دل میں جگہ بنا لی تھی البتہ جو نئے رنگروٹ تھے اُن کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت تھا بینکر نوید بظاہر لاپرواہ چیونگم چباتا کھلنڈرا نوجوان تھا جسے اس کی مستقل مزاجی کی وجہ سے میں نے ٹیم میں بھرتی کر لیا تھا۔ ایک برس پیشتر اس نے مجھے فون کیا اپنا تعارف کروایا اور درخواست پیش کی کہ سر اگلے برس کیا آپ مجھے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔۔۔ میں نے نہایت سرد مہری سے کہا کہ میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم واقعی اس بارے میں سنجیدہ ہو۔۔۔ کہنے لگا سر یہ ثابت کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا۔۔۔ میں نے کہا تمہیں ہفتے میں دوبار فون کر کے یہ کہنا ہو گا کہ سر میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے پورا سال ہر ہفتے دوبار فون کیا اور سر۔۔۔ میرا نام نوید ہے میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔۔ اور یہ فقرہ سُن سُن کر جب میں اور میرے فون کا ریسیور تنگ آ گئے تو میں نے اُسے بھرتی کر لیا۔

بقاء شیخ اور خالد ملتانیے تھے اور ان کے بارے میں اہل لاہور ہمیشہ شکوک میں مبتلا رہتے ہیں۔۔۔ یہ باقاعدہ ٹریک کا پہلا دن تھا۔۔۔ اب سفر کے ساتھ اُن کی خصلتیں واضح ہوں گی، اُن کی کینگیاں سطح پر تیریں گی اور اُن کی خوبیاں، درماندگی اور مشکل وقتوں میں ظاہر ہوں گی۔۔۔ بقاء اور خالد اس سے پیشتر شمالی علاقوں کو موٹر سائیکلوں سے چھان چکے تھے اور اسی لئے آج پیدل چلتے ہوئے بار بار بائیں جانب عادتاً نگاہ کرتے تھے۔ وہ اب بھی موٹر سائیکل پر سفر کر رہے تھے اور بیک ویو مرر میں اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں کی موجودگی کا اطمینان کرنا چاہ رہے تھے۔۔

ایک اور آبشار بلندی پر بہت تھی اور اس کا شور ہمارے کانوں میں بہت تھا۔

ہر شخص اپنے بدن کے بارے میں، بوٹوں اور پاؤں کے بارے میں فکرمند تھا۔۔۔ آج کی واک نے انہیں بتاتا تھا کہ آئندہ دنوں کی کوہ نوردی اور دربدری میں اُن کا بدن، پاؤں اور بوٹ ساتھ دیتے ہیں یا وہ ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے کو ہیں۔۔۔ میرے پاؤں میں میرے رفیق وہی بوٹ تھے جو مجھے اسکولے سے کنکورڈیا تک لے گئے تھے اور انہوں نے میرے پاؤں کو ایک نوزائیدہ بچے کی پشت کی طرح نازک اور ملائم رکھا تھا۔ گوری ندی میں سے نہا کے نکلے تو اس کے گورے بدن کی طرح کھنکتا اور جوان رکھا تھا۔۔ مجھے اُمید تھی کہ اس بار بھی یہ میرا ساتھ دیں گے۔

"فوٹو کھچ اوئے۔۔۔" یہ خالد تھا ایک پہاڑی نالے کے مخدوش پُل پر اپنے آپ کو بمشکل قائم رکھے بقاء کو کہہ رہا تھا اور بقاء مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ جب اُس پر کچھ اثر نہ ہوا تو خالد نے اُسے چیخ کر فوٹو کھینچنے کو کہا۔ اس پر بقاء ناراض ہو گیا "چیختے کیوں ہو۔ کھینچتا ہوں" اُس نے کیمرہ نکال کر اس کا رُخ خالد کی طرف کیا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا "اوئے اس نیم تاریکی میں فوٹو نہیں آسکتی"

"نہیں آسکتی تو پھر بھی کھینچ دے۔۔۔ میں نے پوز بنایا ہوا ہے" بقاء نے حکم کی تعمیل کر دی۔

خالد ندیم ہم میں سے شائد واحد ٹیم ممبر تھا جس کے لئے یہ ٹریک زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اسکولے میں اُس کے لبوں تک کنکورڈیا کا جام آیا تھا اور لب بام کی قربت میں اس کی صحت کی کمند ٹوٹ گئی تھی یا ڈاکٹر عمر نے توڑ دی تھی۔ لاہور واپسی پر اس کے یاروں نے اُسے بہت آزردہ اور بے عزت کیا تھا اور اس بار وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ چاہے پوری ٹیم واپس چلی جائے۔ سو خرآباد کے جنگلوں میں آگ لگ جائے۔ سنو ٹائیگر اُسے کھا جائیں، وہ دریا برد ہو جائے لیکن وہ کسی حالت میں واپس نہیں جا رہا تھا۔

سب لوگ خاموشی سے چلتے جاتے تھے۔

وادی تنگ تھی اور ہم اس میں دریا کی قربت اور آبشاروں کے شور میں گھرے ہوئے۔۔۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف نیم تاریکی میں قدم اٹھاتے تھے۔

احد اور امین پورٹروں کے قافلے کے ساتھ بہت آگے جا چکے تھے۔

میرے پاؤں تھک رہے تھے۔

ایک اور آبشار کا شور حاوی ہوا تو میں رُک گیا۔۔۔ میرا بدن ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔۔۔ میرا منہ سانس کے لئے ہانپتا تھا اور میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ یہیں کہیں سو جانا چاہتا

تھا۔ شہری آسائشوں اور عمر کے زوال نے میرے بدن کی ڈالیوں پر گھونسلے بنا رکھے تھے اور اُن میں تھکاوٹ اور پژمردگی کے پرندے بولتے تھے۔۔۔ اس کے باوجود میں ان عوامل کو نظرانداز کرکے اپنے آپ کو پہاڑوں کی بے رحمی اور سنگ دلی کے حوالے کیوں کر دیتا تھا۔ کیا میں کچھ ثابت کرنا چاہتا تھا؟۔۔۔ میں اپنے ماچو۔۔۔ مردانگی کے امیج کو برقرار رکھنے کے لئے حقائق سے نظریں چراتا تھا؟ ایسا ہرگز نہیں تھا۔۔ میں ان کی ہوس اور کشش کے ہاتھوں بے بس تھا۔۔ شرپا تن زنگ کے ہمراہ ایورسٹ پر قدم رکھنے والا ایڈمنڈ ہلیری چالیس برس بعد دنیا کی بلند ترین چوٹی کی جانب پھر سے سفر کرنا چاہتا تھا اور اُس کے ڈاکٹر اُسے خبردار کرتے ہیں کہ تمہارے پھیپھڑے اب اس قابل نہیں رہے۔ تم زیادہ سے زیادہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر جا سکتے ہو۔۔۔ اور وہ اسی بلندی تک جا کر رُک جاتا ہے اور ایورسٹ کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کی چوٹی پر کبھی وہ تھا۔۔۔ صرف ارادہ بدن کے مسمار شدہ ملبے کے پار نہیں جا سکتا۔۔۔ میں ابھی ہلیری کی طرح مسمار نہیں ہوا تھا لیکن اینٹیں اُکھڑ رہی تھیں۔

میرے ساتھی آگے جا چکے تھے اور میں آبشار کے شور اور اُس کی پھوار میں گھلتی شام کی سیاہی میں تنہا تھا۔ کہیں آگے ایک مقام تھا جہاں ہم نے آج کی شب کے لئے پڑاؤ کرنا تھا۔۔۔ کسی منزل نامعلوم میں۔۔۔ اور اجنبی وادی کی نہ دکھتی ہوئی آبشاروں کے آس پاس۔۔۔ ہمارے خیمے نصب ہونے تھے۔۔۔ اور یہی نامعلوم اور اجنبیت ہی اصل کرشمہ تھا جو شہر میں، شہرت کی زندگی میں مجھے بلاتا ہے۔۔۔ جو اس تجربے میں سے نہیں گذرا۔۔۔ کہ ایک دن کے اختتام پر اُس کے خیمے تلے گھاس ہوگی یا ریت۔۔۔ خیمے کے پردے میں سے چٹانیں نظر آئیں گی یا ایک وادی کا پھیلاؤ۔۔۔ اور رات ہوا میں کونسی مہک ہوگی۔۔۔ سیاہ گلابوں کی۔۔۔ برف کی ٹھنڈک کی یا پانی کی نمی کی۔۔۔ یا شاید جانوروں کی لید کی۔۔۔ اور بلندی کی وجہ سے سانس بھی آئے گا یا رات کروٹیں بدلتے گزرے گی۔۔۔ اور خیمہ بستی کے درمیان جو الاؤ روشن ہوگا اُس میں کیا کیا چہرے اور شکلیں نظر آئیں گی۔۔۔ وہ نہیں جانتا کہ اُس نے زندگی ضائع کر دی۔

آبشار کی نمی مجھے آہستہ آہستہ بھگو رہی تھی اور پہاڑوں کی رات کی ٹھنڈک مجھے سرد کر رہی تھی۔۔۔ میں نے ایک گہرا سانس بھرا اور پھر سے چلنے لگا۔۔۔ نالے کے کنارے راستہ ذرا ترچھا ہوا اور پھر وادی کھلنے لگی۔ پہاڑ کھسکتے ہوئے ذرا دُوری پر چلے گئے اور سرسبز کھیتوں کے درمیان ایک جھونپڑا نظر آیا جس کے پس منظر میں جو گلیشیر تھا اُس پر ابھی تک سورج کی زردی کے شائبے تھے۔ جھونپڑے اور کھیتوں کے پیچھے ایک ایسا ویرانہ

تھا جس میں جا بجا جھاڑیاں تھیں اور اُن کے درمیان ریتلی زمین پر گلیشیر سے آتی چھوٹی چھوٹی نالیاں اور تالاب تھے۔۔۔ اور ان کے درمیان مجھے نیلا کچن ٹینٹ بلند ہوتا نظر آیا۔۔۔ یہ کوئی خاص مقام یا متعین منزل نہ تھی۔ شام ہو رہی تھی اور ہمیں اپنے خیمے لگانے تھے اور یہاں ہموار ریت تھی اور قربت میں تازہ پانی رواں تھا۔۔۔ بیشتر لوگ جھکے ہوئے تھے اور خیموں کی رسیاں کھینچ کر ان عارضی گھروں کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس ٹریک کے دوران اگلو خیمہ میرا گھر نہ تھا۔

وہ کہیں کسی شخص کی نالائقی سے سکردو اور گلگت کے درمیان لاپتہ ہو گیا تھا اور میں چنگیزی کے عنایت کردہ بھورے رنگ کے ایک پچھو نما خیمے کو کھول کر پریشان حال تھا کہ کونسا راڈ کہاں فٹ ہوگا اور کونسی کمان سے اس کے بے جان بدن میں تناؤ آئے گا۔

احد اور تنگیر میرے پاس آگئے "صاحب ہم کوشش کرتے ہیں"

میں رُک سیک سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔۔ سرسبز کھیتوں کی سیاہ ہریالی کے پس منظر میں جو برف تھی وہ میرے سامنے ریت سے گھرے ایک چھوٹے سے تالاب میں ایک تصویر بناتی تھی جو نیم تاریکی میں بھی نظر آتی تھی۔۔۔ ماجد، ایک پھرتیلا پورٹر از جاگل کا مگ تھامے میرے پاس آگیا "صاحب۔۔۔"

میں نے مگ تھام لیا۔

"کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہیں؟" اُس نے کہا

"کیا حال ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

پورے ٹریک کے دوران ماجد پورٹر کی ووکیبلری۔۔۔ ہیں؟ ناک چڑھا کر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ ہاں! مسکرا کر۔۔۔ سے آگے نہیں گئی۔

جونہی خیمے ایستادہ ہوئے سب لوگ پانی سے باہر تڑپتی مچھلیوں کی طرح غڑاپ غڑاپ اپنی آسائش کے پانیوں میں اتر گئے۔

امین، ماجد کی مدد سے رات کا کھانا تیار کر رہا تھا۔ وہ بار بار دیگچے میں جھانکتا اور آنکھیں ملتا ہوا کہتا "بہت اچھا کھانا ہے۔۔۔"

"امین ہم کل کہاں پہنچیں گے؟"

وہ اپنا ایپرن اُتار کر پھدکتا ہوا میرے پاس آگیا "کل پہنچ جائیں گے"

"کہاں پہنچیں گے؟"

"اُدھر---" اُس نے تاریکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اُدھر کدھر؟"

"اُدھر آپ جدھر کہیں گے پہنچ جائیں گے--- کیوں نہیں پہنچیں گے" وہ واپس چلا گیا۔

مجھے شک ہوا کہ وہ ان علاقوں کو بھی نہیں جانتا اور مقامی پورٹرز سے معلومات حاصل کرنے کے چکر میں ہے---

پورٹر ماجد پھر آ گیا "صاحب---" اُس کے ہاتھ میں ایک اور مگ تھا۔

"سُوپ ہے؟" میں نے مگ تھام کر اس میں جھانکا

"ہیں؟" اُس نے ناک چڑھا کر کہا۔

"سُوپ ہے؟" میں نے جان بُوجھ کر پھر پوچھا۔

"ہاں---" وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

رات کے کھانے پر کچن ٹینٹ میں کیا خوب رونق تھی--- اس کے نیلے پردوں کے آس پاس اندھیرا تھا۔ ایک نامعلوم جگہ تھی اور اندر گیس لیمپ کی روشنی میں نیم ممبر زمین پر ایسی آسانی سے بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں آپ کے نازک مقامات تلے پتھر نہ ہوں--- کوئی کنکر نہ ہو۔ اور ابھی پہلی شب تھی اس لئے بے آرام ہونے کے باوجود شکایت نہیں کر رہے تھے۔ البتہ سردی ہمارے اندازے سے کہیں بڑھ کر تھی یا شاید ہمارے بدن ابھی گلگت میں تھے اور انہیں عادت نہیں ہو رہی تھی---

ڈنر کے لئے دال چاول تھے اور ایک انوکھا ذائقہ لئے ہوئے تھے جس سے کسی پہاڑی شب میں گیس لیمپ کی روشنی میں تھکا ہوا بدن ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

"گڈ بندوبست---" دال چاول نوش کرنے کے بعد نوید نے چائے کا مگ بلند کر کے مجھ سے کہا۔

اور اس "گڈ بندوبست" کا ایک پس منظر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لوئر سٹاف کے کچن میں جب آرمی کے کمانڈنگ افسر تشریف لا کر جوانوں کے لئے تیار کردہ خوراک چکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا پکا ہے کیونکہ چکھنے سے انہیں ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ کیا پکا ہے تو صوبیدار اپنی گرجدار آواز میں بتاتا ہے کہ کیا پکا ہے۔ اس پر کمانڈنگ افسر ہمیشہ "گڈ بندوبست" کی شاباش دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز جب بدمزہ خوراک سے تنگ آئے ہوئے ایک جوان سے انہوں نے پوچھا کہ کیا پکا ہے تو اُس نے خفی ہو کر زیرِ لب کہا "والدہ صاحبہ کا بھیجا پکا ہے سَر---" "تو افسر صاحب نے فوراً کہا" گڈ بندوبست---" فسادِ خلق

کے خوف سے جوان نے والدہ صاحب کے جس حصّے کے بارے میں کہا تھا اُسے درج نہیں کیا جا سکتا--- تو نوید جب بھی خوش ہوتا یا ناخوش ہوتا تو ہمیشہ "گڈ بندوبست" کا نعرہ لگاتا۔

شب بسری کا گڈ بندوبست کچھ یوں تھا۔ وکیل حضرات یعنی میاں صاحب اور شاہد اپنے خصوصی چھپیریا خیمے کو ساتھ لائے تھے۔ بقاء اور خالد کا بھی خصوصی بندوبست تھا۔ اگرچہ خالد نے آفر دی تھی کہ وہ کسی بھی شخص کے ساتھ سونے کو تیار ہے--- میں نے خالد ندیم کو اپنے ساتھ سلانا بلکہ خیمے میں سلانا بہتر جانا کیونکہ--- میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں حتیٰ کہ اس میں بھی خالد رات کو بیدار ہو کر صرف بنیان میں ملبوس باہر چلا جائے اور کسی پتھر پر بیٹھ کر گلیشئر کی خنکی میں رات گذار کر حواس باختہ ہو جائے اور ہمیں اُسے گلگت واپس بھیجنا پڑے---

"تارڑ صاحب---" میری آفر پر وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا "مجھے اگر آپ اجازت دیں تو میں کچن ٹینٹ میں سونا چاہوں گا---"

"کچن ٹینٹ میں؟--- چولہوں، دیگچیوں اور--- پورٹرز کے ہمراہ؟"

"جی سَر--"

"لیکن کیوں؟"

"جناب آپ اپنے ٹینٹ کو ایک نظر دیکھیں---"

میں نے اپنے ٹینٹ کو ایک نظر دیکھا--- "نیا نکور کورین ٹینٹ ہے اور بے حد خوش نما ڈیزائن کا ہے۔ برف کا طوفان بھی آ جائے تو اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور اندر لیٹے ہوئے شخص کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ باہر---"

"بالکل درست ہو گا--- لیکن اس کی شکل ایک جوک کی طرح ہے"

"جوک--- یعنی لطیفہ؟"

"نہیں نہیں--" اس نے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھا "وہ والی جوک جو ہمارے چھپڑوں میں ہوتی ہے--- آپ نے جوک کے بارے میں وہ والا جوک یعنی لطیفہ نہیں سنا کہ ایک انگریز سیاح کسی چھپڑ میں سے گذرا تو--- ایک جوک کہیں اس کے بدن میں داخل ہو گئی-- تو اس نے ایک پینڈو بندے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اور اُس نے معائنہ کے بعد کہا کہ صاحب یہ جوک ہے-- تو انگریز صاحب نے عمناک کہا--- ہاف بلڈی انسائڈ--- ہاف بلڈی آؤٹ سائیڈ اینڈ یُو کال اِٹ اے جوک---"

خالد ندیم جیسے بیبے انسان سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس قسم کا بیہودہ لطیفہ سنائے گا اور میرے کورین خیمے کو جوہڑوں میں پائی جانے والی جونک یا جوک سے تشبیہ

دے گا۔

"چلو میں مانتا ہوں کہ اس کی ٹیپ پر زمین سے چمٹی ہوئی ایک جوک کا شائبہ ہوتا ہے تو---"

"تو یہ کہ مجھے اس غار نما خیمے میں جبس بے جا ہو جائے گا---"

"اور وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پتہ نہیں-- آج میاں صاحب کہہ رہے تھے کہ میں ادھر آگیا ہوں اور میری حبس بے جا کی ایک رٹ ہائی کورٹ میں پینڈنگ ہے--- لیکن کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دم گھٹنے لگا---"

"تو ہم روشن دان کا پردہ کھول دیں گے"

"آپ کی بڑی مہربانی---" اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا "خنگل میں بھی رات کے وقت خیمے میں میرا دم گھٹنے لگا تھا تو میں باہر آگیا تھا--- میں ایک مرتبہ پھر یہاں سے واپس جا کر دوستوں اور بیوی کے سامنے ذلیل و خوار نہیں ہونا چاہتا۔ کچن ٹینٹ بڑا اور ہوادار ہے اور میں اپنا منہ باہر نکال کر وہاں سو جاؤں گا--- پلیز---"

"جیسے تمہاری مرضی--"

اس نے اپنا سلیپنگ بیگ سمیٹا اور اُسے سر پر رکھ لیا--- اور پورے ٹریک میں اس کی یہ عادت ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ وہ جو کچھ اٹھاتا تھا سر پر اٹھاتا تھا اور پھر کسی بڑی اماں کی طرح ڈولتا ہوا چلتا تھا--- وہ کچن ٹینٹ کی طرف چلا گیا۔

میرے حصے میں بلکہ خیمے میں نوید آگیا۔

"نوید ادھر ہے؟" فوری طور پر خالد ملتانی نے میرے خیمے میں جھانکا۔

"ہاں--"

"بس یہی پوچھنا تھا--" وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

رات بہت دیر تک پورٹرز کی آوازیں آتی رہیں--

بہت دیر تک سیاہ ہراول پر جھکے گلیشیر میں سے اترتے نالوں کا دھیما شور سنائی دیتا رہا--

پھر خاموشی ہو گئی۔

جیسے ایک شب میں نے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا تھا--

ایسے آج کی شب--- دریائے کرومبر کی قربت میں--- میں نے پھر شاہ گوری کو خواب میں دیکھا۔

اور آپ کتنی دیر ایک خواب کی رفاقت میں رہ سکتے ہیں کیونکہ مجھے تو اس جھیل کی جانب سفر کرنا تھا جس کے کناروں پر بلند گھاس تھی اور جس کے برفپوش سطح پر سردیوں کے زمانے میں خوش گاؤ کے قافلے چلتے تھے--- احد صرف سوختر آباد تک گیا تھا-- اور اُس سے پرے ایک دو پورٹر یہ کہتے تھے کہ ہم اُس علاقے کو جانتے ہیں، ہمارے خاندان کے کچھ لوگ گھوڑوں اور مویشیوں کو لے کر ادھر جاتے ہیں لیکن ہم نہیں گئے--- سوختر آباد سے پرے نامعلوم کے اندھیرے تھے-- بس یہی وسوسے--- یہی واہمے۔ نامعلوم کے خوف کے ساتھ اُس جھیل کی کشش شب بھر رہی-- اگرچہ اُس شب آنکھوں میں نیند اتنی بھری کہ آس پاس کی کچھ خبر نہ رہی۔ لیکن شب بھر رہا چرچا ترا--

پیازین

"گلیشئر کرومبر کا اور جنگل پیازین کا اور خالد گمشد"

سلیپنگ بیگ کی گرم آغوش میں سے میں نے سر نکالا تو میرے اوپر خیمے کا پردہ تاریک نہ تھا۔۔ اس پر ایک ہلکی روشنی ٹھہری ہوئی تھی اور بہت مدھم' ہوا کی آواز تھی۔

نوید پچھلی شب جس کروٹ سویا تھا وہ اسی حالت میں خوابیدہ تھا۔

میں رینگتا ہوا خیمے سے باہر آگیا۔۔ اور کچھ دیر ذرا حواس باختہ رہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔۔۔ نیند کی عارضی موت میں آپ فراموش کر دیتے ہیں کہ پچھلی شب آپ کہاں سوئے تھے۔۔ نارمل زندگی میں آپ جانتے ہیں کہ میرے دائیں ہاتھ ٹیبل لیمپ ہے' بائیں جانب تپائی پر کلاک ہے اس کے برابر میں پانی کا گلاس ہے اور جب آپ بیدار ہوتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر کونسا پروگرام چل رہا ہے لیکن جہاں ہر شب آپ کی خواب گاہ بدل جائے وہاں۔۔۔ آنکھ کھلنے پر ہمیشہ آپ حیران ہوتے ہیں اگرچہ چند لمحوں کے لئے کہ میں کہاں ہوں۔۔۔ یہاں دریائے کرومبر کچھ فاصلے پر تھا اور اس کی آواز رُک رُک کر آتی تھی۔ ہرے کھیتوں اور اکلوتے جھونپڑے کے اوپر گلیشئر پر زرد کرنیں رینگتی ہوئی اس کے سفید وجود پر اتر رہی تھیں اور ہوا میں کنیلی تازگی تھی۔۔۔ زندگی کا وہ سانس جو شفاف اور کُن فیکون کے پہلے لمحے کی طرح پوتر اور کھنکتا ہوا تھا۔

پورٹرز۔۔۔ کچھ کچن ٹینٹ میں۔۔ کچھ پتھروں کی اوٹ میں۔۔ یا کھلے آسمان تلے نیند میں مدہوش تھے۔

احد ایک چست بدن اتھلیٹ کی طرح بیدار ہو چکا تھا اور ناشتے کے انتظامات میں مصروف تھا۔۔

"تارڑ صاحب۔۔۔ کارن فلیکس۔۔۔"

اور گرم دودھ کے ساتھ کڑکڑاتا ہوا کارن فلیکس اس تنہا کوہستانی صبح میں ایک شاہانہ خوراک تھی۔۔ اور اس کے بعد اُبلتے سے ذرا ادھر گرم کافی۔۔

خیموں کے پردے اٹھنے لگے۔۔ زپوں کے کھلنے کی سرسراہٹ۔۔ اور ایک ایک کر کے ٹیم ممبرز آنکھیں ملتے ہوئے باہر آنے لگے۔

ناشتے کے بعد ہر شخص تنہائی کی تلاش میں تھا۔۔۔ کوئی ایسا گوشہ۔۔ کوئی ایسی آڑ' کوئی خفیہ اور اوجھل جگہ جہاں پانی کی قربت ہو۔

کوہ نوردی کی ان گنت چارمز ہیں لیکن ان میں سے ایک چارم ایسی ہے جسے بیان کرنے سے شاید دوسرے کوہ نورد جھجکتے ہیں یا شاید مناسب نہیں سمجھتے یا شاید انہوں نے اس پر غور ہی نہ کیا ہو۔۔۔ بہرحال میں ہرگز نہیں جھجکتا۔۔۔ اور وہ ہے "اوجھل جگہوں" کی ویرانی۔۔ جنہیں میں نے "پانی پیلس" کا نام دیا تھا۔ آپ اپنی نارمل اور شستہ زندگی میں ہر صبح بیدار ہوتے ہیں اور پھر قدرتی دباؤ کے تحت ایک ہی 10 x 5 فٹ۔۔۔ یا اس سے بڑے یا اس سے مختصر غسل خانے میں جاتے ہیں اور اپنی زندگی کا کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ وہاں گذارتے ہیں۔ نہانے کے لئے۔ شیو کرنے کے لئے اور فراغت حاصل کرنے کے لئے۔ برسوں تک۔ برس ہا برس تک اس تنگ قید خانے میں آپ فارغ ہوتے ہیں لیکن۔۔۔ کوہ نوردی میں' آوارہ گردی میں۔۔۔ ہر صبح۔۔۔ آپ ایک نئے اور اجنبی اور اکثر اوقات ششدر کر دینے والے منظر میں "بیٹھتے" ہیں۔۔۔ میرے لئے یہ ایک عجیب کشش ہے۔۔۔ فیری میڈو کے جنگلوں میں' ہمپ میدان میں' نانگا پربت کے فل ویو کے سامنے۔۔ کوروفون کی ندیوں کے درمیان۔ اردوکس کی گھاس پر۔۔۔ کنکورڈیا کے برف زار کی ایک کلو میٹر گہری برف پر۔۔ دیوسائی کے پھولوں کی رفاقت میں۔۔۔ کیا کوہ نوردی کا یہ ایک سراسر مختلف زاویہ نہیں ہے۔۔۔؟ یہاں۔۔۔ میں ناشتے کے بعد ادھر ادھر بھٹکتا ہوں۔۔۔ چھوٹی چھوٹی برفانی ندیوں کو پھلانگتا۔۔ جھاڑیوں کے کانٹوں سے دامن چھڑاتا میں ایک ایسی جگہ پہنچتا ہوں جہاں سے ہماری خیمہ گاہ نظر آتی ہے لیکن انہیں میں نظر نہیں آتا۔۔۔ یا میرا خیال ہے کہ میں نظر نہیں آتا۔۔ وہاں ان چھوٹی ریت ہے۔ وہ ہوا ہے جو برف کو بوسے دیتی نیچے میرے بدن تک آتی ہے۔ شفاف تالاب اور رواں پانی ہیں جو آپ کی نشست کو ڈسٹرب کئے بغیر گذر رہا ہے۔۔۔ اگرچہ اس پانی کی یخ بستگی مقامات آہ و فغاں کو عارضی طور پر مفقود کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔۔

تو میرے لئے کوہ نوردی کی یہ الگ سی اور خوشگوار سی پہچان ہے۔

میں خوش و خرم واپس آیا تو خیمے سمیٹے جا رہے تھے۔

خالد ایک پژمردہ سی جھاڑی کے درمیان کھڑا بقاء کو حکم دے رہا تھا "فوٹو کھیچ اوئے۔۔۔"

احد--- ایک منتظم کی حیثیت سے سامان اور خیمے پیک کروا رہا تھا--- پھر اس نے ہر پورٹر کے لئے متعینہ بوجھ یعنی 25 کلو سامان کانٹے پر تولا اور ان میں تقسیم کرنے لگا۔

سرسبز کھیتوں میں سے جھونپڑے کی جانب سے کچھ لوگ نیچے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ تھا--- کیا تھا دوری کی وجہ سے پتہ نہ چلتا تھا البتہ جو کچھ بھی تھا سفید تھا اور پھڑپھڑاتا تھا--- وہ قریب ہوئے تو واضح ہوا کہ چند مرغیاں برائے فروخت ہیں اور یہ پھڑپھڑاتی ہوئی نعمت ہم نے فوراً خرید لی--- دراصل آج ہمارے ٹریک کا باقاعدہ آغاز ہو رہا تھا-- کل تو سویرے ہم گلگت میں تھے۔ پھر جیپوں میں اپاہج بنے اشت تک پہنچے، اور دو چار گھنٹے کی چہل قدمی کے بعد یہاں حترن داس پہنچ گئے۔ اصل امتحان آج تھا ہمارے پاؤں کی صحت کا اور ارادے کا---

میں نے کے۔ٹو ٹریک کے آزمودہ نسخے کے مطابق اپنے آپ کو تیار کیا--- بوٹوں میں ٹیلکم پاؤڈر کا چھڑکاؤ۔ پھر سوتی جرابیں اور ان پر پاؤڈر کی تہہ۔ پھر موٹی اونی جرابیں اور ان پر بھی بے دریغ پاؤڈر۔

احد پورٹرز میں سامان تقسیم کرنے کے بعد چھڑی سنبھالتا میرے پاس آگیا "صرف آپ کا خیمہ رہ گیا ہے باقی سب تو پیک ہو گئے۔ اگر آپ تیار ہیں تو اسے سمیٹ لیں؟--- تگیر" اس نے خوش دل، ہر وقت چترال ٹوپی اوڑھے باریش تگیر کو پکارا۔ وہ ٹوپی درست کرتا ہوا ہنستا ہوا آگیا۔

"جی صاحب---"

"صاحب کا ٹینٹ اتارو---"

"لگتا ہے تو اب اتار بھی دے گا"

"احد--- آج ہم کہاں پہنچیں گے؟"

"ابھی سامنے جو پہاڑ ہے اس کے پیچھے کرومبر گلیشیئر پوشیدہ ہے۔ اسے کراس کریں گے۔ پھر دوسری طرف اتر کر باڑین کے جنگل میں کھانے کے لئے رکیں گے۔ پھر دریا کے ساتھ چلتے ہوئے جہاں چٹانیں ختم ہوں گی وہاں سے دریا کراس کریں گے اور پھر بہت ہری بھری وادی ہے صاحب، اس میں ہم رات کریں گے"

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کے۔ٹو ٹریک کا ہر پڑاؤ--- ہر منزل--- جہاں ایک دن کی مسافت کے بعد رات کرنی ہے، طے شدہ اور جانا پہچانا ہے--- ٹریکنگ اور کوہ پیمائی کی ہر کتاب میں ان خیمہ گاہوں کے نام بلندیوں کے بھاری پتھروں کے عشق میں مبتلا کر کب مجھ ہاتھوں سے اٹھتا ہے--- مبتلا حضرات کے دلوں کی دھڑکن تیز کرتے ہیں اور

ان کی نارمل زندگیوں میں فتور پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، ملازمت، پیشے کی یکسانیت میں الجھے ہوئے ان کے خواب دیکھتے ہیں-- اسکولے، کوروفون، پائیو، اردوکس، گورے--- ایسی منزلیں ہیں جو انسانی وجود میں سرایت کر کے اسے بے بس کر دیتی ہیں۔ عشق بھی تو بے بسی کا دوسرا نام ہے-- لیکن جھیل کرومبر کی تلاش میں سرگرداں آوارہ گردوں کے لئے ایسے کوئی خواب خیال نام نہ تھے جن کی آرزو سے وہ مست ہوتے اور دیوانہ وار ان محبوب ناموں کی چاہت میں سفر کرتے جاتے--- یہاں ہمارے سامنے ایک دھند تھی جس میں صرف سوختر آباد کا سوختہ چہرہ--- کبھی کبھار خیال میں نظر آجاتا یا جھیل کرومبر کے نیل و نیل پانی اپنی چھب دکھلاتے لیکن ان کے سوا دھند کے دبیز پردے تھے اور ان میں جو کچھ پوشیدہ تھا صرف تب ظاہر ہوتا تھا جب ہم نے وہاں پہنچنا تھا--- کوئی گائیڈ بک ہمارا راستہ متعین نہیں کر سکتی تھی، کوئی گائیڈ ہمارا ہاتھ تھام کر ہمیں وہاں نہیں لے جا سکتا تھا--- ہمیں خود دھند کے اس پردے کے اندر جا کر دیکھنا تھا کہ وہاں کیا ہے؟--- فنا ہے یا بقا ہے--- اور آج کی رات ہمارے خیمے کہاں نصب ہوں گے-- ہم نہیں جانتے تھے--- احد کا بھی خیال تھا کہ وہاں ایک ہری بھری وادی ہے اس میں ہم رات کریں گے--- لیکن وہ بھی نہیں جانتا تھا--- صرف وہ جانتا تھا جو کائنات کا گائیڈ ہے--- اس نے وہ مقام متعین کر رکھا تھا ہماری موت کے دن کی طرح جہاں ہم نے رات بسر کرنی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتا تھا کہ یہ لوگ--- یہ حقیر لوگ مجھے جاننے کے لئے--- پہچاننے کے لئے میری عظمت اور جلال کے مظاہر میں آئے ہیں۔ میرے تخلیق کردہ پہاڑوں-- اور چٹانوں اور وادیوں میں بھٹکنے کے لئے آئے ہیں--- اگر آئے ہیں تو میں انہیں راستہ دکھاؤں گا--- تو ہم سر جھکائے حاکم کے حکم کے تابع اس متروک راستے پر چلنے لگے جو ایک مختصر مسافت کے بعد کرومبر گلیشیئر کے پاؤں میں جا رکتا تھا--- یکلخت اس کا اختتام ہو جاتا تھا--- یہیں تک کسی زمانے میں جیپ بھی آتی ہوگی جہاں اب جھاڑیاں سرکنڈے اور پتھر تھے-- جیسے اسکولے روڈ کو یکدم ایک عمودی بلندی روک کر منقطع کر دیتی ہے--

وہ ہمیں دیکھتا تھا--- اور ہم اسے دیکھنے آئے تھے۔

اور ہم دیکھتے تھے کہ نیلی جھاڑیوں اور پستہ قد درختوں اور ویرانے میں ابھرے پتھروں کے درمیان جو متروک راستہ ہے اس کی ریتلی مٹی ہمارے قدموں کے نشانوں کو بخوشی قبول کرتی ہے کہ یہ نشان بہت کم اس کے نصیب میں ہوتے تھے، اور ہم دیکھتے تھے کہ اس راستے کے اختتام پر ایک گھنے جنگل کے اوپر ایک چٹیل اور ویران پہاڑ کا وجود

ہے جس پر سویر کی دھوپ ابھی زرد نرمی سے ہاتھ ڈالتی ہے اور ہم ابھی سائے میں اور ٹھنڈک میں سر جھکائے چلتے تھے--- سر جھکا کر چلنا ایک کوہ نورد کی نیت بھی ہے اور ضرورت بھی--- وہ کسی فرض کی ادائیگی کے لئے ثواب کمانے کے لئے نیت کر کے سر جھکا کر نہیں چلتا بلکہ شکرگزار ہو کر مسکین اور بے آسرا ہو کر مدد کا طالب ہو کر--- چلتا ہے۔

ایک کوہ نورد اگرچہ باقاعدہ معنوں میں فلسفی نہیں ہوتا لیکن وہ باقاعدہ دنیادار فلسفیوں کی نسبت کہیں زیادہ گہرائی میں جا کر اپنے اندر کے راز کو، سراغ زندگی کو پانے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے--- ایک ٹریک پر موت کے فریب سے ماورا ہو کر جب وہ سر جھکائے چلتا ہے تو خالی الذہن ہو کر--- نہیں چلتا--- اس کے پاس ایک مکمل تنہائی ہوتی ہے--- جس میں وہ اترتا ہے اور وہاں اس کے سامنے زندگی اور کائنات کے بھید آہستہ آہستہ تصویر ہونے لگتے ہیں--

بقاء ایک پھُولے ہوئے پیراشوٹ نما جامنی رنگ کے ٹریک سوٹ میں ملبوس میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ خالد ندیم ایک خوش و خرم ایک خوش شکل اونٹنی کے ساتھ وصال کے بعد کسی اونٹ کی طرح اپنے جوش جنوں میں بہت آگے جا چکا تھا اور میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

شاہد اپنے مخصوص ٹھپ ٹھپ انداز میں واکنگ سٹک پر انحصار کرتا میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

پورٹرز حسب عادت بہت آگے پہنچے تھے۔

متروک شدہ راستے کی پتھریلی دیوار میں ایک شگاف تھا جہاں احد میرا منتظر تھا۔

"تارڑ صاحب--- یہ راستہ آگے جا کر بلاک ہو جاتا ہے--- ادھر آئیں--- اوپر کرومبر گلیشئر ہے---" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا غائب ہو گیا۔

جھاڑیوں میں اور جابجا ابھرے پتھروں کی اونچ نیچ میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کدھر جانا ہے لیکن میں نے احد کو ایک اٹھتی ہوئی بلندی پر چڑھتے دیکھا تھا--- میں سانس لینے کے لئے--- بلکہ ہوا کی کشش میں--- تھوڑی دیر کے لئے رُکا--- رُکا تو بلندی کی وہی نیلی اور خمار زدہ مہک میرے نتھنوں میں آئی--- میں نے ہاتھ پھیلا کر اپنی ہتھیلی کی پشت کو دیکھا جس پر جھریاں مردہ مرغابی کے پنجوں کی طرح بے جان اور بے رُوح تھیں۔ اپنے پاؤں میں بوجھل ہوتے تھکاوٹ کے احساس کو پرکھا--- اپنے آسائش پرست بدن کی درماندگی کو محسوس کیا--- اس بلند ہوتے بھربھرے راستے کو دیکھا جس کے دوسری جانب کرومبر گلیشئر تھا اور پھر اپنے آپ سے ایک مرتبہ پھر پوچھا--- تم یہاں کیا لینے آئے

ہو--- اور پھر کہیں سے جواب آیا--- میں خود تو نہیں آیا لایا گیا ہوں--- میرے پاس دنیا جہان کی خوشیاں ہیں--- بچوں کی کائنات ہے--- بیوی کی وفاشعار دنیا ہے--- اور کچھ شہرت ہے--- لیکن اس کے باوجود مجھ میں گنجائش باقی رہ جاتی ہے--- مجھے کشش چین نہیں لینے دیتی--- اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا تو میں کیسے ہل سکتا ہوں--- میں اگر ہلا ہوں تو اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ مجھ میں ابھی گنجائش ہے--- ایک خلاء ہے--- مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں یہاں کیا لینے آیا ہوں--- اس سے پوچھو!

میں نے واکنگ سٹک کی گرفت پر مٹھی بھینچی اور پھر سے چلنے لگا۔

وہ بلندی اگرچہ دوست نہ تھی--- میرے وزن کو سہارنے سے انکاری ہوتی تھی--- اور میرے جھکے ہوئے بدن کو ناپسند کرتی تھی لیکن اس کے باوجود میں تھوڑی دیر میں--- اُوپر وہاں تھا جہاں سے کرومبر گلیشئر کا سیاہ اور پتھریلا وجود میری نظروں کے سامنے سانس لے رہا تھا۔

گلیشئر بھی جھیلوں کی طرح ہوتے ہیں!

وہ رواں ہوتی ہیں اور یہ منجمد لیکن یہ دونوں جس طور نظر اور حواس پر اثرانداز ہوتے ہیں ان میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے--- دونوں کو یکدم اپنے سامنے پا کر انسان چپ ہو جاتا ہے--- وہ بے یقینی کے وسوسوں میں اُلجھ کر منہ کھولے انہیں دیکھتا رہتا ہے۔ درجنوں جھیلیں دیکھنے کے بعد بھی ایک گمنام اور پوشیدہ جھیل جب آپ کے سامنے اترتی ہے بلکہ نازل ہوتی ہے تو وہ محسوسات کی شدت کے حوالے سے آپ کی پہلی جھیل ہوتی ہے--- اس کے پانیوں میں بے شک بے شمار بدن اترے ہوں لیکن وہ ایک کنواری جھیل ہوتی ہے-- جب آپ اس میں اترتے ہیں تو اس کے پانی زیادہ ہو جاتے ہیں--- گلیشئر بھی انہی کے قرابت دار ہیں--- بے شک آپ درجنوں گلیشئرز دیکھ چکے ہوں۔ پار کر چکے ہوں لیکن ہر نیا گلیشئر اپنی ہیئت اور وسعت میں--- آپ کا پہلا گلیشئر ہوتا ہے---

کرومبر گلیشئر دائیں جانب سے اپنی برف منجمدگی میں اتر رہا تھا--- اور خوش بختی یہ تھی کہ اس کی بھول بھلیاں اور دراڑیں کہیں اوپر تھیں اور مجھے اس کے قدموں کے ساتھ لگ کر نیچے اتر جانا تھا--- یہاں وہ آخری دموں پر تھا اس کے اختتام کی سرد مہری کے پہلو میں سے مجھے گزر جانا تھا۔

بہت ہی مدھم برف کے پگھلنے کی آوازیں تھیں۔

ان کی گونج دار پکاریں کبھی کبھی آپ کے کانوں میں سراسیمگی بھرتی تھیں--- اور ان پتھروں کی تھیں جو پگھلتی برف میں اپنا مقام کھو کر نیچے کھائیوں میں لڑھکتے جاتے

تھے۔

گلیشئر کی خاموشی کبھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی--- اس کی شکست و ریخت کی صدا ہر چند لمحوں بعد دل میں گہرے خوف بھرتی تھی۔

سُرمئی ریتلی ڈھلوان پر ہمارے پورٹرز کے قدموں کے نشان تھے۔

میں ان پر قدم رکھتا تو بھربھری چٹانی ریت بوٹوں کے نیچے سے کھسکتی جاتی--- میں انتہائی انہماک اور احتیاط سے قدم دھرتا چلا جا رہا تھا۔ حسب توقع سنگریزے اور کنکر لڑھکتے ہوئے کہیں نیچے کھائی میں جاتے تھے اور بغیر آواز کے گم ہو جاتے تھے۔ کہیں بہت نیچے اس ڈھکی ہوئی برف کے نیچے وہ منبع تھا جہاں سے دریائے کرومبر جنم لے رہا تھا۔

کرومبر گلیشئر بالتورو نہ تھا کہ مسلسل پانچ روز تک ہمیں اپنی برفانی دنیا میں سرگرداں اور ہراساں رکھتا اس نے صرف ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ہمیں رخصت ہو جانے کی اجازت مرحمت فرما دی--- اس لئے کہ ہم اس کے پورے وجود پر نہیں چلے تھے صرف قدم بوسی کو آئے تھے--- اور آ کر چلے۔ یہاں سے جو منظر تھا اس میں اس بلندی سے نیچے درخت اور پتھر کسی عمارتی ماڈل کی طرح مختصر نظر آتے تھے اور ریت کے ٹیلوں میں گھرے، برفانی پانیوں کا ایک تالاب نیلاہٹ کا شوخ دھبہ تھا اور اس کے کنارے میرے ساتھیوں کے وجود چیونٹیوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔

میں بھی نیچے آنے لگا--- اگرچہ پھسلتا اور بے اختیار ہوتا ہوا لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ گروں گا تو نیچے ریت اور پانی ہے کوئی تند دریا یا برف کے نوکیلے اہرام نہیں ہیں۔

تالاب تک پہنچا تو میں نے رُک سیک اتار کر ریت پر اوندھے منہ لیٹ کر براہ راست اس کے برف پانیوں پر لب رکھ کر اپنی پیاس بجھائی۔

دھوپ میں نوکیلی تیزی تھی اور بدن میں سے پسینہ پھوٹتا ہوا باقاعدہ محسوس ہوتا تھا۔

کچھ جھاڑیاں۔ چند ٹیڑھے درخت اور بہت بڑے حجم کے تین چار پتھر--- اور ان کے پار گئے تو اس پتھریلی ویرانی اور چٹانی سلسلوں میں ایک جنگل نظر نواز ہوا--- میں پُرشوق اور تھکا ہوا اس میں اترا تو اس کے سایوں میں خنک پانی اور ندیاں رواں تھیں اور احد ان ندیوں سے حاصل شدہ پانی میں ازجائل گھول کر--- ہمارا منتظر تھا--- اور مجھے سُوپ کی اشتہا انگیز مہک بھی آ رہی تھی۔ ازجائل کا پہلا گھونٹ میرے نمی کو ترسے ہوئے بدن کے لُوں لُوں میں اترا اور مجھے ان ندیوں کی طرح تر و تازہ کیا جو ہمارے آس

پاس بہتی تھیں--- میں نے تر و تازگی کے اطمینان میں بازو پھیلائے اور آس پاس نگاہ کی--- خالد ندیم کے سوا سب ممبران درختوں کے سائے میں نرم ریت پر لیٹے ہوئے استراحت فرما رہے تھے--- وہ تو ہراول دستے میں بے مہار اونٹ ہو رہا تھا---

"خالد کہاں ہے؟" میں نے احد سے دریافت کیا۔

اس نے ایک لاپروائی کی نظر اپنے گرد ڈالی اور کہنے لگا "وہ یہاں نہیں ہے"

"کہیں آگے تو نہیں چلا گیا؟"

"نہیں صاحب یہ ممکن نہیں۔ بس یہی راستہ ہے اور ہم بہت دیر سے یہاں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے تھے"

میاں صاحب لیٹے ہوئے اٹھے لیکن وہ ایک فکرمند چہرہ لئے اٹھے "سب سے آگے چل رہا تھا--- اور پیچھے تو نہیں رہ سکتا"

"نہیں---" سب لوگ میرے قریب آ گئے "اگر وہ آگے چل رہا تھا اور پیچھے رہ جاتا تو ہم اُسے کراس کرتے"

"وہ یہاں تک نہیں پہنچا صاحب---" احد کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

"آخری بار اُسے کس نے کہاں دیکھا تھا؟"

"میں نے اُسے گلیشئر پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا---" شاہد نے ہیٹ اتار کر اپنے بالوں کو ہوا لگوائی۔ "اس کے بعد نظر نہیں آیا"

بلندیوں پر یکدم لاپتہ ہو جانا میلے میں گم ہو جانا یا کسی راستے پر بھٹک جانا نہیں ہے کہ تھوڑے بہت تردد اور پریشانی کے بعد آپ مل جاتے ہیں یا راستہ دریافت کر لیتے ہیں--- جہاں کوئی راستہ نہ ہو اور ہر پتھریلی اوٹ میں آپ سے چند قدم آگے چلتے ہوئے ساتھی اوجھل ہوتے جاتے ہوں تو آپ بے شک کسی ڈھلوان پر زخمی حالت میں پڑے ہوں یا کسی دراڑ کی تہہ میں ہوں ان کو خبر تک نہیں ہوتی---

"احد--- تم کرومبر گلیشئر کو جانتے ہو؟"

"نہیں--- لیکن میں گلیشئر کو جانتا ہوں"

"اپنے ساتھ دو بہترین پورٹر لو--- اور آؤ"

میرے ہمراہ نوید اور میاں صاحب بھی چلنے لگے۔

ہم جنگل سے باہر پھر اس برفانی تالاب اور گیڑے درختوں کے میدان میں واپس آئے--- سامنے کرومبر کی ہیبت بلند ہو رہی تھی اور اس میں کہیں--- خالد ندیم تھا۔

میرا سانس اتنا پختہ نہ تھا کہ میں دونوں پورٹروں اور احد کے ساتھ گلیشئر کی دیوار

چڑھ کر اس کی خطرناک ڈھلوانوں میں اترتا اور خالد کو تلاش کرتا۔

ایک بلند پتھر پر جہاں دھوپ کی شدت اور آکسیجن کی کمی بدن کو پگھلاتی تھی میں رُکا اور وہ آگے چلے گئے--- ہم نے تھوڑی دیر میں ان تینوں کو اس تالاب کے کنارے کنارے چلتے اور پھر گلیشیئر کی بلند فصیل پر رینگتے دیکھا اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہم صرف انتظار کر سکتے تھے۔

اور اس انتظار کے ہر لمحے میں--- وہاں وادیٔ اشکومن سے کہیں آگے، کرومبر گلیشیئر کے پار، ایک کوہستانی کائنات کی تنہائی میں ایک بڑے پتھر پر سلگتی دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہر لمحے میں کسی بڑے المیے یا موت کے سوا کوئی تصویر نہ بنتی تھی--- اگر خالد عدیم ہم سب سے آگے چل رہا تھا اور پیازین کے جنگل میں نہیں پہنچا تو وہ کہاں ہو سکتا ہے--- ممکنات کا دائرہ بے حد محدود تھا--- اگر وہ سب سے آگے چل رہا تھا اور تھکاوٹ کی وجہ سے سُست ہو جاتا ہے تو ہم میں سے کسی ایک نے اُسے پیچھے رہ جاتے دیکھا ہوتا--- جب کہ وہاں ایک ہی راستہ تھا--- وہ کہاں گیا--- ظاہر ہے وہ کرومبر گلیشیئر میں کہیں تھا اور اگر اب تک وہیں تھا تو اپنی مرضی سے وہاں ریلیکس نہیں کر رہا تھا--- کسی ایسی حالت میں تھا جو اُس کے بس میں نہیں تھی--- اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے ذہن میں۔ دھوپ اور بلندی سے اور شاید عمر کے زوال سے بوکھلائے ہوئے ذہن میں سوال گردش کر رہے تھے--- اگر وہ کرومبر گلیشیئر میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے--- احد اور پورٹرز کو نہیں ملتا تو پھر مجھے کیا کرنا ہے-- یہی کرنا ہے کہ پیازین کے جنگل میں کیمپ کرنا ہے اور تمام پورٹرز کو کرومبر کی برفوں میں تلاش کے لئے بکھیر دینا اور انتظار کرنا ہے-- اور اگر وہ پھر بھی نہیں ملتا تو کیا صورتِ حال ہو گی--- مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ اگر وہ پھر بھی نہیں ملتا تو مجھے کیا کرنا ہے، اور اگر وہ مل جاتا ہے تو کس حالت میں ملتا ہے؟

یہ داخان پامیر مہم کا--- کرومبر جھیل کے خواب کا آخری دن ہے اس کے بارے میں مجھے یقین ہو گیا تھا۔ ہمیں یہیں سے واپس جانا تھا-- اگر وہ زخمی حالت میں ملتا ہے تب بھی اور اگر--- یہاں سے حترن داس--- وہاں سے امت--- اور اگر جیپ مل جائے تو پورے دن کے بعد گلگت اور اگلے روز اگر فلائٹ پر جگہ مل جائے اور اگر موسم خراب نہ ہو تو ایک اور دن-- تو یہ کتنے دن کا واپسی کا سفر ہو گا لاہور تک-- تقریباً پانچ روز--- تو کیا ایک لاش--- اگر ہم اُسے پیازین کے جنگل کے درختوں سے تراشیدہ ایک آڑے ترچھے نامکمل تابوت میں بند کر لیں تو کیا--- یہ ڈیڈ باڈی لاہور تک پہنچ سکتی ہے؟

اور وہاں میں اس کے بیوی بچوں کو کیا جواب دوں گا--

یہ تصویریں-- ایک ڈرے ہوئے، ہراساں ہو جانے والے ذہن میں نہیں آ رہی تھیں-- اپنے سامنے ایک نسبتاً گمنام گلیشیئر میں اوجھل ہو جانے والے تین مددگار لوگوں کی پچھلے پون گھنٹے سے گمشدگی کے بعد واضح ہو رہی تھیں-- اور ان میں کوئی ابہام نہ تھا--- کوئی فینٹسی یا خواب و خیال نہ تھا۔ کڑی دھوپ میں اُس بلندی پر ایک شفاف حقیقت تھی۔

نوید بار بار اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجا بنا کر گلیشیئر کے بے پایاں وجود کو دیکھتا "خدا خیر کرے--- انہیں اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا---"

لیکن ہم تابوت کس طرح بنائیں گے؟

ہمارے پاس رندہ--- آری-- یا کیلیں وغیرہ تو ہیں نہیں--- ہم میں سے کسی کے پاس تابوت بنانے کا تجربہ نہیں-- اگر درختوں کی شاخوں سے سٹریچر بنا کر اُسے رسیوں سے باندھ کر لے جائیں گے تو--- لاش خراب ہو جائے گی--- میرا خیال ہے اُسے یہیں پیازین کے جنگل میں جہاں ریت آسانی سے کھودی جا سکتی ہے۔ دفن کر دینا مناسب ہو گا--- مجھے یقین ہے کہ ہما کو نمازِ جنازہ کی تفصیلات کا علم ہو گا--- لیکن اس کی بیوی یہاں تک--- کیسے آئے گی--

ہر آشفتہ سر، آوارہ گرد کے نصیب میں کہیں نہ کہیں ایک المیہ ہوتا ہے--

وہ اس المیے کا منتظر ہوتا ہے--- اور اس سے خوفزدہ بھی-- آپ جو خرد سے روگردانی کرتے ہیں--- عقلِ سلیم کی مخالف سمت میں چلتے ہیں--- شرافت کی بجائے رسوائی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو کہیں نہ کہیں اس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے--- میں اس بڑے پتھر پر کرومبر گلیشیئر کو پتھرائی ہوئی نظروں سے تکتا اس المیے کا منتظر تھا--- میں اُسے متعدد بار جُل دینے میں، فریب دے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا-- نانگا پربت بیس کیمپ سے ناکام واپسی پر--- تھامس کے ہاتھوں کے سہارے لٹکتے ہوئے--- کامیاب واپسی پر سلجوق کے زرد ہوتے چہرے--- اندھیری شب میں، فیری میڈو کے جنگلوں میں سے مشعلوں کی روشنی میں واپس ہو کر--- برالدو کے ڈھلتے سپاٹ سے لرزیدہ بدن کے ساتھ گذرتے-- بالتورو کی دراڑوں کو پھلانگتے--- گورے کی منجمد شب کو سہار جانے میں--- میں کامیاب ہو چکا تھا--- یہ فنا کے لمحے اگرچہ بلندیوں پر ہی نہیں لاہور کی ایک شاہراہ پر کار کے ٹائر برسٹ ہونے پر بھی وجود میں آ سکتے ہیں--- لیکن یہاں--- اس بڑے پتھر پر--- وادیٔ اشکومن سے پرے--- یہاں عشق مَن ہے--- یا اشک ہے--- یا

صرف عشق ہے-- لیکن یہاں وہ لمحہ آن پہنچا تھا-- اب تک میں نے اُسے جُل دیا تھا--- اور اب-- وہ میری شاہ رگ تک آن پہنچا تھا--

اِن خیالوں میں--- اِن واہموں میں--- جو کسی بھی لمحے حقیقت کا رُوپ دھار سکتے تھے میں تب تک جلتا رہا جب تک--- گلیشئر کی پتھریلی، ریتلی اور پوشیدہ برفوں کی بلند فصیل پر دو اشیاء جو ہمیں پتھر دکھائی دیتے تھے-- اب دھیرے دھیرے حرکت میں تھے اور نیچے اُتر رہے تھے۔

"نوید-- تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟"

"سر-- میرا خیال ہے کہ دونوں پورٹر واپس آ رہے ہیں-- نگیر اور اسماعیل-- احد نہیں ہے"

"کیوں نہیں ہے؟"

وہ چُپ ہو گیا۔

احد کیوں نہیں ہے-- وہ کہاں اور کس کے پاس رہ گیا ہے-- اور وہ کس حالت میں ہے--

ایک مدت بعد--- اور وقت تھما ہوا تھا-- اور اس وقت میں تھمتے ہوئے وہ پورٹر ہمارے قریب آ رہے تھے--- پتھروں اور جھاڑیوں میں سے گذرتے--- قریب آ رہے تھے۔

اور تب نوید نے گلیشئر کی دیوار پر دو نامعلوم وجود سپاٹ کئے--- اس نے انہیں بہت دیر دیکھا-- اور پھر کہا "احد ہے--- اور--- مبارک ہو-- اس کے پیچھے خالد ہے"

"تمہیں دکھائی دے رہا ہے؟"

"نہیں-- لیکن مجھے خالد کا سُرخ رُک سیک نظر آ رہا ہے--- اور اُسے اٹھائے ہوئے جو شخص ہے اس کی ٹانگیں--- ایک اونٹ کی طرح لمبی-- اور بے مہار ہیں"

"تب--- وہ وہی ہے"

دونوں پورٹر ہمارے قریب آ گئے-- اور پھر کچھ کہے بغیر آگے چلے گئے-- اور خالد ندیم اور احد ابھی واضح نہیں ہوتے تھے-- صرف دو وجود تھے جن میں سے ایک کی کمر پر رُک سیک تھا اور وہ ہم تک نہیں پہنچے تھے تو میں اور نوید اس بڑے پتھر سے بمشکل اُٹھے--- ہم اِس دوران پتھر کے ساتھ پتھر ہو چکے تھے-- اٹھے اور بیاژین کے جنگل کی جانب واپس اُترنے لگے-- خالد ندیم کا چہرہ زرد تھا اور وہ ایک ایسا اونٹ تھا جو صحرا میں کئی روز بھٹک کر-- اپنی حماقت سے بھٹک کر-- جب بالآخر کسی نخلستان میں آ نکلتا ہے تو اپنے

ساتھی اونٹوں سے نظر ملا کر بات نہیں کر سکتا--

"کیا ہوا تھا؟" میں نے کرومبر کی تمام برفوں میں اتنی سردی نہیں ہو گی جس سرد لہجے میں مَیں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ ناراض ہیں!"

"نہیں میں ناراض نہیں ہوں---" میرا لہجہ مزید منجمد ہو گیا۔ "کیا ہوا تھا؟"

بیاژین جنگل کے درخت بھی اس لمحے میری سرد مہری کی تاب نہ لا سکے اور ہوا کے زور کے باوجود منجمد ہو کر ساکت ہو گئے۔

"میں--- صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں وہ خالد ندیم نہیں ہوں جو تھلتی سے واپس چلا گیا تھا-- اسی لئے میں سب سے آگے آگے چل رہا تھا---" وہ دم لینے کے لئے رُکا-- اس کا خیال تھا کہ کوئی بولے گا اور کوئی بھی نہیں بولا--- بیاژین میں ایسا سکوت تھا کہ اگر وہاں کوئی پرندے تھے تو وہ بھی منقار زیر پر تھے "تو پھر کرومبر آ گیا اور-- اگرچہ میں بہت ڈرا ہوا تھا لیکن تیز تیز چلتا رہا اور وہاں راستہ تو تھا نہیں- میں سیدھا جانے کی بجائے بائیں جانب مُڑ گیا اور آپ سب لوگ سیدھے جا چکے تھے-- پھر میں تھک گیا چلتے چلتے-- اور وہاں ایک بہت ہولناک کھائی میرے سامنے آ گئی جسے میں عبور نہیں کر سکتا تھا اور میں جان گیا کہ کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہو---اور تب میں اس کے کنارے پر بیٹھ گیا اور میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی نہیں-- میں تنہا ہوں-- اور میرے سر پر سے بڑے بڑے پتھر گرتے تھے اور نیچے کھائی کے نیچے ایک بہت خوفناک ندی ہے--- اور میں وہیں بیٹھ گیا-- میرا خیال تھا کہ آپ لوگ ابھی وہاں سے گذریں گے تو میں آپ کے ساتھ چلنے لگوں گا--- لیکن وہاں کوئی نہ آیا اور تارڑ صاحب--- مجھے بہت ڈر لگا- کیونکہ مجھے میری چھٹی حس بتاتی تھی کہ میں غلط راستے پر نکل آیا ہوں اور گم ہو گیا ہوں- میں نے اپنی پوری قوت سے شور مچایا کہ--- تارڑ صاحب--- تارڑ صاحب--- میں یہاں ہوں- لیکن وہاں پتھر گرنے سے گونج پیدا ہو رہی تھیں اور ندی کا شور تھا اور میں--- اکیلا تھا--- جیسے کل کائنات ختم ہو گئی ہو--- چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا اور پھر میں تھک ہار کر وہاں ڈھیر ہو گیا صرف اِس اُمید میں کہ شاید آپ میں سے کوئی میری مدد کو آ جائے--- مجھے جناب تارڑ صاحب--- وہاں بہت ڈر لگا تھا--- مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں مر جاؤں گا--- میں وہیں بیٹھا رہا اور پھر میرے کانوں میں پتھروں اور ندی کے شور سے بلند ہوتی ہوئی احد کی ایک مخصوص سیٹی کی آواز آئی--- اور تب میں پھر سے چیخنے لگا--- میں یہاں ہوں-- احد بھائی میں یہاں ہوں--"

پھر بھی کوئی نہ بولا--- نہ میاں صاحب--- نہ نوید--- کوئی بھی نہ بولا--

"مجھے معاف کر دیجئے تارڑ صاحب--- اور آپ سب لوگ---"

اس کے جواب میں جو کچھ میں نے کہا اور ٹیم ممبران کے خیالات کی ترجمانی کی--- شاید پیازین کے درخت بھی اُسے دوہرانا مناسب نہ سمجھیں۔

یہ ایک حماقت تھی-- ایک اعلیٰ درجے کی حماقت جو خالد ندیم جیسے کسی اونٹ سے ہی سرزد ہو سکتی تھی--

مشترکہ عدالتی فیصلے کے مطابق وہ آئندہ ٹیم کے درمیان میں--- ہی سفر کرے گا--- سب کی نظروں کے سامنے--- نہ آگے چلے گا--- نہ پیچھے--- اور خالد ندیم نے ایک اونٹ کی طرح ہی سر تسلیم خم کر دیا۔

شین

"دریائے شین کا سونا اور---- وادا سلاجیت کھاتا ہے"

موت اور پیازین کے درختوں سے ساختہ تابوت کے خیال سے آزاد ہو کر جب میں نے اُوپر دیکھا تو وہاں گھنی شاخوں میں سے کہیں کہیں وہ دھوپ اُترتی تھی جو اس بڑے پتھر پر خالد ندیم کی ناامید واپسی کے لئے منتظر میرے چہرے کو خنک اور پژمردہ کرتی تھی۔

اور اب میں یہاں سے آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔

اِن کوہ نوردیوں کے دوران ایسے مقام بھی آتے ہیں جب کوہ نورد آگے نہیں جانا چاہتا-- آگے جا کر کیا حصول ہو گا۔

یہی تو دنیا کا اختتام ہے--

تمنگل کے گلابی کھیتوں سے آگے کونسا جہان ہو گا جو اس سے بہتر ہو گا--

رتی گلی کی چوٹی سے اُترتے ہوئے ایک شفاف ندی کے کنارے جو بے انت سُرخ پھول ہیں۔ ان کی سرخی سے جُدا ہو کر انسان کہاں جا سکتا ہے۔

جھیل جھیوا جہاں سے ایک نیلگوں شاہچے کی صورت دِکھتی ہے--- اور گئی رات دکھتی ہے تو وہاں واٹر کے پہلے ٹمپس سیکھ کر کدھر جاتا ہے--

جیسے اندھیرے میں ماچس کی تیلی جلنے سے ایک چہرہ روشن ہوتا ہے ایسے کنکورڈیا کی سویر میں شاہ گوری ظاہر ہو تو اس سے جُدا ہو کر کہاں جاتا ہے۔

پیازین کے جنگل میں بھی یہی لمحہ مجھ پر آیا--- درختوں تلے خنک آسودگی اور ستھرے پانیوں کا بہاؤ--- اور یہ لمحہ آ کر گذر گیا۔ اگر میں ایسے لمحوں کی سرگوشیوں پر دھیان دیتا تو کبھی پیازین تک نہ پہنچتا--- پیازین جنگلوں کو چھوڑنے سے ہی نئے لمحے تخلیق ہوتے ہیں۔

لنچ میں نوڈل سوپ کے بعد ٹیونا فش اور پنیر کے کریکر سینڈوچ سرو ہوئے لیکن اس "تہذیب یافتہ" خوراک سے ہماری تسلی نہ ہوئی اور پھر پراٹھے نوش کر کے مکمل

آسودگی حاصل کی گئی-- خالد ندیم ایک درخت سے ٹیک لگائے ہم سب سے الگ ایک شرمندہ کتورے کی طرح رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ اب تو معاف کر دو اور ہر نوالے کو مشکل سے حلق سے اتارتا تھا۔

پورٹرز اپنی سوکھی روٹیوں کو دھواں آلود نمکین چائے سے کب کے نگل چکے تھے اور اب اپنے بوجھ کو رسّوں میں جکڑ کر تیار بیٹھے تھے۔

اشت سے احد کا ایک سرخ و سفید بھتیجا زاہد جو شکل سے بورس ملسن کا قرابت دار لگتا تھا ہمارا ہم رکاب ہو گیا تھا۔ زاہد بقول لاہوری محاورے کے ہر وقت اپنی "ٹیں" میں رہتا تھا اور ذرا گردن اکڑا کر اور بہت ہی "مجھے کیا پرواہ ہے" سٹائل میں ہمیشہ مخاطب کی بجائے دور افق پر ایک جعلی متانت سے گھورتا ہوا بات کرتا تھا۔ وہ اگرچہ گلگت میں سلاجیت بیچتا تھا لیکن پڑھا لکھا تھا اور ذرا شغل میلے اور مفت کے ایک ٹرپ کی کشش نے اُسے ہمارے ساتھ کر دیا تھا--- جونہی خالد ملتانی کو علم ہوا کہ گلگت میں وہ اعلیٰ پائے کی سلاجیت کا بیوپاری ہے تو وہ فی الفور اُس کے ساتھ فرینڈلی ہو گیا۔

"یار زاہد میرے جوڑوں میں اکثر درد رہتا ہے--- سنا ہے کہ چلاس کے پہاڑوں میں جو سلاجیت پائی جاتی ہے بہت لوہے توڑ قسم کی چیز ہوتی ہے"

"ہاں ہاں---" زاہد نے ایک ڈاکٹر کی سنجیدگی سے کہا "رات کو ایک ماشہ سلاجیت گرم دودھ میں ملا کر پیو تو صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے"

"اچھا اچھا" خالد کی باچھیں کِھل گئیں "اور رات کو بھی ٹھیک ہو جاؤ گے کہ نہیں---"

"ہاں میرا دادا کھاتا ہے تو بہت خوش ہوتا ہے۔"

"آپ کی دادی بھی خوش ہوتی ہو گی---"

زاہد کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ خالد ملتانی کیا کہہ گیا ہے---

زاہد کی جس خصوصیت نے ہمیں پہلے پہل بے حد ہراساں کیا وہ سوخر آباد کے پہاڑی راستے کے بارے میں اس کے ہولناک بیانات تھے۔ اگرچہ تھوڑے سے تجربے کے بعد ہم ان بیانات کی تہہ تک پہنچ گئے--- وہ بچپن میں اُدھر جا چکا تھا اور اپنے آپ کو بہت سپرمین محسوس کرتا تھا کہ یہ راستے تو صرف میں جانتا ہوں۔ چنانچہ بیازین جنگل سے نکلتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا کہ آگے کس قسم کا ٹریک ہے--

"آگے---" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "چٹانیں ہیں جن پر مارخور بھی قدم نہیں جما سکتا-- اور برابر میں دریائے شمشین ہے--- میں تو گزر جاؤں گا لیکن آپ--- آپ تو

گریں گے" چنانچہ میرا دو تین ماشے خون تو یہیں خشک ہو گیا۔

بیازین کا جنگل جب پیچھے رہ گیا تو ہم ایک تنگ درہ نما وادی میں اترنے لگے۔

خالد ندیم ایک پیٹے بچے کی طرح سر جھکائے اپنی اونٹ رفتاری پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور بار بار آگے پیچھے نظر ڈال کر گنتی کرتا کہ میرے آگے کتنے لوگ ہیں اور پیچھے کتنے ہیں تاکہ ٹیم کے فیصلے کے مطابق میں درمیان میں چلوں---

دریائے شمشین کا شور ہماری قربت میں ہوا اور پھر ایک ایسی چٹان دکھائی دی جس کی چوٹی ہمیں نظر نہیں آتی تھی اور دریا اُس کے ساتھ لگ کر مزید پُر شور اور بے قابو ہو رہا تھا-- ہم اُس کے قدموں تک آئے اور اب ہم تھے--- یہ چٹان تھی-- اور پانی کی قوت تھی جو اس سے ٹکرا کر تنگ وادی میں ایک مسلسل گونج کی ہولناک لرزش بلند کرتی تھی--- اور کوئی راستہ نہ تھا۔

"احد---" میں نے اُسے پکارا۔ وہ پورے ٹریک میں میرے آس پاس رہتا تھا۔ میرا خیال رکھتا تھا "آگے تو شاید کوئی راستہ نہیں--- صرف چٹانیں ہیں اور دریا ہے"

"آپ آئیں-- چٹان کے ساتھ راستہ ہے"

قریب ہوئے تو چٹان میں ایک موہوم اُمید کی طرح ایک موہوم راستہ تھا۔ ایک گذرگاہ تھی جو جہاں سے گذر جانے کے لئے نہایت موزوں تھی۔ سب لوگ رُک گئے--- پہلے پورٹرز آگے گئے ایک ایک کر کے اگرچہ وہاں ایک شخص کے لئے بھی چلنا یا رینگنا ممکن دکھائی نہ دیتا تھا--- اِس گذرگاہ کے عین نیچے دریا پلٹ پلٹ کر چٹان پر حملہ آور ہو رہا تھا--- احد نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہر چند قدم کے بعد دریا چٹان کے اندر تک جہاں ہمارے پاؤں پڑتے اور اُن پر اُس کی نمی محسوس ہوتی--- وہاں تک آتا--- اور پھر جہاں راستہ نہ ہوتا وہاں دریا کے اوپر لکڑی یا پتھروں کے جھولتے ہوئے پل ہوتے جن پر قدم رکھتے ہی انسان تو نیچے دریا میں چلا جاتا اور شاید صرف اُس کی رُوح بلند ہو کر دوسری جانب قدم رکھتی تھی--- راستے کی ہولناکی کے باوجود یہ اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا زاہد نے پینٹ کیا تھا-- ایک موڑ پر وادی وسیع ہو کر ہماری نظروں کے سامنے سرسبز ہو گئی اور یہاں ہم چٹان سے کُود کر سیدھے اُس ریت پر آ گئے جس کے کناروں پر دریا کی ایک شاخ بلندیوں سے نیچے آ رہی تھی-- ہمیں دریا تو پار نہیں کرنا تھا صرف اِس آبی شاخ کے تیز دھارے میں سے گذر کر دوسری جانب پہنچنا تھا-- میں نے اپنا رُک سیک کندھے سے اُتار کر ریت پر رکھ دیا۔ چٹانوں کے جو سلسلے ہم پر تنگ ہوتے تھے۔ دھوپ کی راہ میں رکاوٹ تھے--- اور اسی لئے اِس آبی رکاوٹ کا نصف

حصہ چھاؤں میں تھا۔۔ "مشکل نہیں ہے۔۔" احمد نے میری بزدلی کو بھانپ لیا تھا "آپ بُوٹ اُتار دیں میں آپ کو پار لے جاؤں گا۔"

"میں چناب کے کناروں کا باسی ہوں۔۔ کم از کم میرے آباؤ اجداد تو تھے۔۔" میں نے ذرا مسخرہ ہونے کی کوشش کی "ہم تو کچے گھڑے پر بھی پار اُتر جاتے ہیں۔۔"

اس بیان پر شاہد نے ہیٹ اُتار کر جہاں کہیں اس کے بال تھے انہیں درست کیا اور کہنے لگا "ویسے مائی لیڈر۔۔۔ آپ تاریخ کو مسخ نہ کریں۔۔ کچے گھڑے کا سہارا لینے والے ہمیشہ درمیان میں جا کر ڈوب جاتے ہیں۔۔۔ سوہنی پار نہیں اُتری تھی"

"سوہنی نے کم از کم کچے گھڑے سے درخواست تو کی تھی کہ۔۔۔ لے چل میڈوں پار لنگھا گھڑیا۔۔۔ ویسے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم وکیلوں میں حس مزاح کی بجائے حس جرح ہوتی ہے" میں نے جل کر کہا اور بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔۔

آبی دھارے کا پانی حسب توقع کٹیلا اور سرد تھا لیکن پاؤں تلے پتھر نہیں ریت آتی تھی۔۔۔ ایسے پہاڑی نالوں کو عبور کرنے کی تکنیک سے اب میں واقف ہو چکا تھا۔۔۔ ان میں چلتے ہوئے آپ چہل قدمی نہ فرمائیں بلکہ پاؤں کو فوری طور پر پانی میں سے نکال کر ہوا میں بلند کریں تاکہ آپ کی رگیں منجمد نہ ہو جائیں۔ جونہی آپ پاؤں باہر نکالتے ہیں تو خون کی گردش کو باہر کی گرمی کا سہارا ملتا ہے۔

چنانچہ انہیں پار کرتے ہوئے آپ شڑاپ شڑاپ تکنیک استعمال کریں۔

پار اُترنا زیادہ دشوار ثابت نہ ہوا۔

ٹیم ممبر اور پورٹر باری باری اس مختصر ندی کی روانی میں اُترتے اور اس کی یکلخت برفانی قوت کو اپنی ٹانگوں پر حملہ آور ہوتے ہی شور مچانے لگتے اور ہنستے ہوئے۔۔ ٹھٹھرتے ہوئے دوسرے کنارے پر آ جاتے۔

دریا کی روانی ریت کے ٹاپوؤں میں تقسیم ہو رہی تھی اور جگہ جگہ جھاڑیاں اور خودرو بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سیا گلابوں کی کثرت اپنا رنگ چٹانوں کے سائے میں شوخ اور مہک آور کرتی تھی۔

اس بے نام مقام پر اس لمحے دریائے شین کے کنارے صرف ہم تھے۔ یہاں چٹانوں کے گہرے سائے اور ہماری باتوں اور پورٹرز کی چیخ و پکار کی گونج تھی۔ یک لخت اس پُرشور ماحول پر بتاؤ کے قہقہے کی آواز حاوی ہو گئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آبی دھارے پر جھکا خوب بے پرواہ ہنسی میں مشغول تھا۔

"کیا ہوا؟"

"تارڑ صاحب۔۔۔ سونا۔۔۔" اس نے ایک لہر کے اُترنے کا انتظار کیا اور پھر اشارہ کیا۔

میں بھی بتاؤ کے پہلو میں ریت پر جھک گیا۔۔۔ ایک اور لہر آئی۔۔۔ میں نے اس کے پیچھے ہٹنے کا انتظار کیا۔ گیلی ریت میں جگہ جگہ دھوپ تھی اور بے شمار ذرّے ستارے ہو رہے تھے۔۔۔ وہ ریت کے بھیگے آسمان میں بھی الگ الگ اور کہیں جھرمٹوں میں چمکتے۔۔ ہم اس سونے کو جمع تو نہیں کر سکتے تھے لیکن اس کی دید نے ہمیں زندگی کے تابناک اور دوسروں سے پوشیدہ رکھنے والے لمحوں کی طرح بے پناہ مسرت عطا کی۔۔۔ خالد ملتانی بھی اپنی واکنگ سٹک ٹیکتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے پُرشوق نگاہوں سے اس کہکشاں کو دیکھا جو ہمارے قدموں میں بچھی تھی اور بتاؤ سے کہنے لگا "فوٹو کھچ اوئے۔۔۔"

بام فلک سے اس گمنام وادی کی ریت میں ہمارے لئے ستارے اُترے تھے۔

ہمارے قدموں میں بکھرے ہوئے تھے۔

آبی دھارے کے پاس سیا گلابوں کی جھاڑیوں کا ایک جنگل تھا جس میں کہیں کہیں پانی رواں تھا۔۔۔ ہم ایک ایک کر کے اس میں گم ہوتے گئے۔

ان جھاڑیوں میں سے ظاہر ہوئے تو ہم دریا سے ذرا بلند ہو چکے تھے اور بالکل سامنے ایک ہری تھی من بھری تھی وادی کے نشیب و فراز دھوپ میں ہرے چکور ہو رہے تھے۔ دائیں جانب دریا کے پار چٹانوں میں سے ایک آبشار بہت دیر تک گرتی تھی۔۔۔ دور سے ساکت لگتی تھی البتہ جب چٹانوں پر گرتی تھی تو وہاں سے ایک ندی کا روپ اختیار کر لیتی تھی۔۔ وادی میں چند ایک جھونپڑے بھی تھے اور ان کے آس پاس گندم اور چارے کے کھیت تھے۔۔۔ اور ہمیں اس وادی کی آخری حد پر جہاں وہ قدرے بلند ہو رہی تھی سہ پہر کی دھوپ میں اپنے پورٹرز نظر آئے جو کچن ٹینٹ ایستادہ کر رہے تھے۔۔۔ ہرے سمندر میں کچن ٹینٹ کی نیلاہٹ ایک بادل کی طرح دکھتی تھی۔

ہم ایک پتھریلی آماجگاہ کے قریب سے گذرے تو اس کے مکینوں نے ہمیں بے یقین حیرت سے دیکھا کہ یہ کون ہیں اور ادھر کیسے آ گئے ہیں۔۔۔ اور پھر ایک باریش نوجوان باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کا ایک غلیظ سا پیالہ تھا جو سفید دہی سے لبریز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہمیں سلام کیا اور پھر اپنی زبان میں کچھ کہہ کر پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔۔۔

"شکریہ" میں نے جھک کر یہ سفید نعمت قبول کر لی اور ٹیم ممبران کو اشارہ کیا کہ وہ فوری طور پر جھونپڑے کے برابر میں دو سایہ دار درختوں تلے استراحت فرمائیں، ریسٹ

کریں کیونکہ ہماری نظر کے سامنے ہماری شب بسری کے بندوبست ہو رہے تھے اور فی الحال چین سے یہ دہی نوش کیا جائے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر شاید اسی قسم کی ایمرجنسی کے لئے اپنے رُک سیک کی جیب میں سنبھالی ہوئی چینی کی ایک پڑیا برآمد کی اور دہی کی سطح پر نہایت ماہرانہ انداز میں چھڑک دی۔۔۔ سب نے اپنے اپنے مگ نکالے اور دہی کی سفیدی اور ٹھنڈک کو نظروں میں اتارتے لسی مانگنے والی فقیرنیوں کی طرح بے چارگی سے کھڑے ہو گئے۔

دہی جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں بلندیوں کے لئے جہاں آکسیجن کم ہوتی ہے اور دل گھبراتا ہے ایک ایسا ٹانک ہے جس کا کوئی جوڑ نہیں۔۔۔ اور یوں بھی لاہوریے ہونے کے ناتے مجھے دہی کی علت ہے۔ میں عادی نشہ باز ہوں' اور یہ دہی وادیٔ حسن داس کی اونچائی پر درختوں کی چھاؤں اور خالد ندیم اینڈ سوڈ کی جان لیوا اذیت کے بعد ایک ساکت دمکتی آبشار کے سکوت کے سامنے۔۔۔ من و سلویٰ تھا جو ہم پر اترا تھا۔۔۔ میٹھا گاڑھا اور چینی کی کھلاوٹ کے ساتھ حلق میں سے اترتا ہوا۔

"خان صاحب ادھر بھینس تو ہوتا نہیں تو یہ گائے کا دہی ہے۔۔۔؟" شاہد نے دہی شڑپتے ہوئے بارلیش نوجوان سے دریافت کیا۔

"ادھر گائے نہیں ہوتا۔۔۔۔"

"تو پھر بکری کا ہے؟"

"ادھر بکری بھی نہیں ہوتا۔۔۔"

"تو پھر۔۔۔" خالد ندیم نے دہی کھاتے ہوئے بریک لگا دی "کس کا ہے؟"

"خوش گاؤ کا۔۔۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"جسے آپ لوگ یاک بولتا ہے۔۔۔"

یاک۔۔۔ یاک۔۔۔ یاک۔۔۔ میں نے متعدد ابکائیوں کی آوازیں سنیں۔

"یاک۔۔۔ یعنی وہ۔۔۔" بٹاہ نے فوراً اپنا مگ گھاس پر رکھ دیا "نام تو سن رکھا ہے لیکن کبھی دیکھا نہیں۔ تارڑ صاحب یہ حلال ہوتا ہے؟"

"اوئے ملتانی" میاں صاحب نے ایک تجربہ کار سر ہلایا "یاک ایک قسم کا بھینسا ہوتا ہے جو صرف بلند ترین پہاڑوں میں پایا جاتا ہے۔ برفوں کی قربت میں۔۔۔ تم دراصل پہلی جماعت بھی پاس نہیں ہو"

"پہلی جماعت کا یاک سے کیا تعلق ہے میاں صاحب؟"

"انگریزی کے قاعدے میں جہاں' اے سے ایپل ہوتا ہے وہاں' وائی سے یاک ہوتا ہے۔۔۔ اور اتنا ہی حلال ہے جتنا کہ۔۔۔ کوئی بھی بھینسا۔۔۔ لیکن یہ دہی یاک کا بھی نہیں ہے"

"ہیں؟" بٹاہ پریشان ہو گیا "باقی کونسا جانور رہ گیا ہے؟"

"یہ یاکنی کا ہے۔۔۔" میاں صاحب لہر میں آ کر بولے۔

ٹریک کے آغاز میں جب بنیادی منصوبہ بندی ہو رہی تھی اور شاہد بار بار پوچھتا تھا کہ تارڑ صاحب اس سفر کے دوران کیا ہم یاک بھی دیکھیں گے تو میاں صاحب نے ایک تاریخی فقرہ کہا تھا "یار شاہد۔۔۔ یاک کو کیا دیکھنا۔۔ ہم نے تو دیکھنا ہے تو یاکنی کو دیکھنا ہے" چنانچہ میاں صاحب کو واضح طور پر مشکوک گردانا گیا کہ یہ یاکنی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔

"الحمدللہ حلال دہی ہے۔" خالد ندیم نے پلاسٹک کے برتن کو اپنے آگے جمایا اور انگلیوں سے دہی چاٹنے میں مشغول ہو گیا۔